خواتین ڈائجسٹ
۱۹۹۶ء

افشاں آفریدی

تمہیں کب کوئی ملال تھا

digest novels lovers group ❤❤

حالانکہ ان کو دیکھ کر پلٹی ہی تھی نگاہ
محسوس یہ ہوا کہ زمانے گزر گئے

نیچے کا منظر دیکھ کر اس کے ہونٹ سیٹی کی صورت وا ہوئے اور پھر بے ساختہ ہی لبوں سے شعر پھسل پڑا.

"ہائیں۔ یہ تمہیں کھڑے کھڑے صدیاں گزر نے کا احتمال کیسے ہو گیا؟" ہانی کی آواز پر اس نے شوخی سے پلٹ کر دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔ چہرے پر ــــ بہت کچھ رقم تھا۔

"یوں لگتا ہے پھر ماہ رخوں اور ماہ جبینوں کا کوئی ٹولہ گزرا ہے یہاں سے؟" ہانی گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی کا مگ تھامے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"میری کافی کہاں ہے؟" اس نے ہانی کو کافی کا سپ لیتے ہوئے بالکنی سے نیچے جھانکتے دیکھا تو جیب سے ہاتھ نکال کر رگڑتے ہوئے سوال کیا۔

"میبل پر پڑی ہے۔" ہانی ہنوز دوسری طرف معروف تھا۔

ہوٹل کے باہر وہ لڑکیوں کا اتنا بڑا گروپ دیکھ کر خاصا حیران ہو رہا تھا۔

"ارے یہ کپ اور کون لایا۔" اس نے مڑ کر بھاپ اُڑاتی کافی کا مگ دیکھ کر بے تحاشا خوشی کا اظہار کیا۔ اور جست بھر کر اندر چلا آیا۔

"ویٹر لایا تھا اس وقت جب آپ ہوش و خرد سے بے گانہ کھڑے تھے۔" ہانی نے بھی اس کی تقلید کی۔

"ہاں یار بس یہ لڑکیاں دیکھ کر تو دلِ ناداں بالکل ہی بے قابو ہونے لگتا ہے۔" ہنستے ہوئے ایک ہاتھ سے بال سنوار کر اس نے مخصوص لب و لہجے میں گوہر افشانی کی۔

"شرم کر لو کچھ۔ ایک تو واہی تباہی بکتے ہو اور وہ بھی واشگاف۔" ہانی نے حسبِ توقع اور حسبِ سابق بُرا سا منہ بنایا۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"ویسے یار ہانی یہ اتنی وافر مقدار میں لڑکیاں آئی کہاں سے ہیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر چینل بدلتے ہوئے ہانی کا لہجہ نظر انداز کیا۔

"پہلے ذرا اردو ٹھیک کر لو اپنی۔ جملے میں" وافر

ناولٹ

مقدار" نہیں بلکہ "وافر تعداد" کا استعمال ہونا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ میں نے ابھی انٹیلیجنس کا محکمہ نہیں جوائن کیا تمہیں آنے جانے والوں کے نام پتے بتاتا رہوں۔"

"کیا واقعی۔" وہ ہانی کے چٹخنے پر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"مجھے تو بس اس بات پر حیرانی ہے کہ یہ ساری لڑکیاں اکیلی ہی یہاں چلی آئی ہیں۔" اس کا قہقہہ تھما تو ہانی نے سادگی سے اپنے تحیر کو لفظوں کا جامہ پہنایا۔

"اکیلا ایک ہوتا ہے بھائی۔ جبکہ "لڑکیاں" تو جمع کا صیغہ ہے۔" اسے اپنا حساب بے باق کرنے کا فوراً ہی موقع مل گیا۔ ہانی نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ کسی کالج یا یونیورسٹی کا گروپ ہے۔" ذرا توقف کے بعد وہ اندازہ لگاتے ہوئے بولا۔

"کمال ہے کیسے ہیں ان کے والدین کہ انہیں یوں بغیر کسی مرد کے یہاں بھیج دیا ہے۔" ہانی کا سنجیدہ لہجہ اسے ہنسا گیا۔

"کم آن یار۔ یہ تو قسمت ہے کہ ہم پر رحم آ گیا ہے تمہیں تو شکر گزار ہونا چاہیے۔" وہ ٹی وی پر متحرک تصاویر کو دیکھ کر اطمینان سے بولا۔

"بکو مت۔ لڑکیاں محض وقت گزاری کا سامان نہیں ہوتیں صہیب حسن یہ بھی ہماری تمہاری طرح انسان ہیں انہیں بے جان کھلونوں کی طرح ٹریٹ مت کیا کرو۔" ہانی کا انداز ناصحانہ تھا۔

"او ہو یہ تمہیں صنفِ مخالف کا درد اتنا کیوں ستا رہا ہے۔ خیریت تو ہے۔ کچھ زیادہ ناصحِ اعظم اور مصلحِ قوم بنتے جا رہے ہو۔" وہ ہنوز لاپرواہی اور شوخی سے کہہ رہا تھا۔

"ناصح یا مصلح بننے کی بات نہیں صہیب۔ بات صرف احساس کرنے کی ہے۔ تم شاید یہ سب نہ سمجھ سکو کہ تمہاری کوئی بہن نہیں جبکہ میں جانتا ہوں کہ لڑکیاں کتنی نازک اور حساس ہوتی ہیں۔" ہانی کا لہجہ یکدم اکھڑا سا ہو گیا۔

صہیب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر ٹی وی بند کر کے اس کی طرف رخ پھیر لیا۔

"کیا بات ہے ہانی۔ تم کیا ہوم سک ہو رہے ہو۔" لہجے میں قدرے پشیمانی کا عنصر بھی تھا۔

"نہیں تو۔" وہ بلاوجہ ہی مسکرا دیا۔ تو وہ موضوع بدلنے کی خاطر فوراً بولا۔

"تو پھر چلو نیچے۔ ذرا گھوم پھر ہی آئیں کل کی برف باری نے تو خاصا بور کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے آج موسم قدرے بہتر ہے۔" وہ بلیک جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت بد ذوق ہو تم۔ لوگ یہاں دور دور سے سنو فال کا منظر دیکھنے آئے ہیں اور تم اس سے ہی بیزار ہو۔" ہانی بھی اٹھ گیا اور پاس پڑا لیدر کوٹ اٹھا لیا۔

"پسند اپنی اپنی مزاج اپنا اپنا۔ مجھے یہ یخ منجمد کر دینے والے سرد موسم کچھ خاص پسند نہیں۔ یہ تو بس تمہاری خاطر چلا آیا ہوں ورنہ میرا بس چلتا تو۔"

"صحرائے گوبی کی سیاحت کو نکل جاتا۔" اس کا جملہ ہانی نے اچک لیا اور چڑانے والے انداز میں پورا کیا۔

"ارے نہیں یار صحرا نوردی تو ہم کب کی کر آئے۔" وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسا مگر اس کی گرے گرین آنکھوں میں یکدم اضطراب اتر آیا تھا۔

"ریئلی یہ کب اور کس کی معیت میں ہوا۔" ہانی نے شوخی آنکھوں میں سموتے ہوئے رازدارانہ اور سرگوشیانہ انداز اپنایا۔ اور قدرے قریب آ کر استفسار کیا۔

"ہائے۔ حادثے بن کے یہاں لوگ ملا کرتے ہیں۔"

"تو بس کوئی ملا بھی اور ہم جا کر آ ہی گئے۔" بالوں میں مضطربانہ انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بظاہر اب بھی ہنس رہا تھا۔

"اور انجام۔" ہانی کا انداز متجسس تھا۔

"انجام یہ کہ گرد سفر لے کے آ گیا۔" وہ بے ساختہ گنگنایا تو ہانی اس کے لہجے میں ٹوٹتے ہوئے کانچ کی چبھن محسوس کر کے الجھ سا گیا۔

"اب چلو بھی۔ کیا یونہی کھڑے کھڑے میرا پوسٹ مارٹم کرتے رہو گے۔" اس نے اپنی طرف بغور دیکھتے ہانی کو ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس کی آنکھوں سے نظریں چراتا باہر نکل آیا۔

ہانی بھی اس کے ساتھ خاموشی سے سیڑھیاں

اترنے لگا البتہ اس کی خاموشی صہیب حسن کو یقین دلا رہی تھی کہ وہ اب تک اس کی ذات کے اُلجھے سروں کو تلاش کرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

اس روز موسم سرما کی آخری سنوفال ہوئی تھی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے برف پگھلنے کا موسم وادی میں اترنے لگا تھا۔

"لو اب جانے کا وقت آیا تو موسم اچھا ہو چلا ہے۔" صہیب نے سرخ اینٹوں سے بنی روش پر چلتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا تو ہانی مسکرا دیا۔

"پاگل ہو تم۔ سنوفال کا ہی تو اصل مزہ ہوتا ہے ورنہ سردی تو بندہ کہیں بھی انجوائے کرنے کے لیے جا سکتا ہے۔" ہانی کا اپنا موقف تھا۔

"کیا خاک مزہ ہوتا ہے سنوفال کا۔ گھر میں بند خاموشی سے گرتی ہوئی سفید برف کو تکے جاؤ نہ کہیں آنے کے نہ جانے کے۔" اس نے منہ بنایا۔

"میری جان جب ماہ عسل منانے کے لیے اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ آؤ گے تو خود دیکھنا وہ بھی اسی موسم کا انتخاب کریں گی۔ ایک سوائے تمہارے پوری دنیا کے لوگوں کے پاس جمالیاتی حس کی کمی نہیں۔" ہانی حسب معمول اس سے اختلاف کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ جبکہ اس کا شادی کے ذکر پر ہی موڈ آف ہو گیا۔

"خیریت تم کہاں کی سیر پر روانہ ہو۔" اس کی خاموشی ہانی نے جلدی محسوس کر لی۔

"کہیں نہیں۔" جیبوں سے ہاتھ نکال کر اس نے آنکھیں بند کر کے پپوٹوں پر انگلیاں پھیریں۔

"ویسے یار صہیب! آگے تیرا کیا ارادہ ہے؟" اچانک ہی ہانی نے سوال کر ڈالا۔

"کس سلسلے میں؟" اس نے سوالیہ نظریں مرکوز کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"بھئی ظاہر ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے تم نے کوئی نہ کوئی تو لائحہ عمل سوچ رکھا ہی ہو گا۔"

"ہوں۔ مجھے سوچنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی۔ ماموں جان نے ممی کے حصے کا بزنس اسٹارٹ کر کے مجھے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے سنبھالوں گا۔" اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

"اور اس کے علاوہ۔" ہانی نے سنجیدگی سے سلسلۂ گفتگو دوبارہ استوار کیا۔

"اس کے علاوہ؟ کمائیں گے اور کھائیں گے۔" وہ ہنسا۔

"اور شادی۔" ہانی نے گویا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"کوئی ضروری ہے شادی کرنا۔" جبراً مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے ہانی کی استفہامیہ آنکھوں میں دیکھا۔

"ایک بات بتاؤ صہیب! آخر تم شادی سے اتنے الرجک کیوں ہو گئے ہو۔ آنرز کے پہلے سال میں تو نیما وقار کے لیے تم دیوانے ہوا کرتے تھے اور آنرز پارٹ ٹو تک تو یہ دیوانگی جنون میں بدل گئی تھی۔ تم اس کے لیے سنجیدہ تھے اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ پھر اچانک جانے کیا بات ہوئی کہ تم نیما اور شادی دونوں سے بیزار ہو گئے۔ آخر اس ساری کہانی کا پس منظر کیا ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ۔" ہانی نے آج پھر کئی دن بعد گزری ساعتوں کی راکھ میں سے چنگاری تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی پس منظر نہیں یار۔" چند لمحے بعد وہ کہہ رہا تھا۔ "بس دل بھر گیا۔ تمہیں تو معلوم ہے میری سیماب طبیعت کس طرح مجھے بھٹکائے پھرتی ہے۔" وہ رکا اور آگے جانے کے بجائے پلٹ کر دوبارہ اسی روش پر چلنے لگا۔

ہانی نے بھی اس کی تقلید کی اور بے یقین نظریں اس کی سبزی مائل بھوری آنکھوں میں جما دیں جن میں آج بھی کئی طوفانوں کی تندی اور تباہ کاری مچل رہی تھی۔

"مگر کچھ عرصہ پہلے تو تم خاصے مستقل مزاج ہوا کرتے تھے۔ یہ اچانک تبدیلی کیسے آ گئی۔ تم نے متلون مزاجی کی ردا کیسے اوڑھ لی۔" ہانی کا انداز اگلوانے والا تھا آج وہ اس پنڈورا باکس کو کھولنے پر کمربستہ تھا جس کے اندر اتنا کچھ بند تھا کہ اس کا باہر نہ نکلنا ہی بہتر تھا۔

"نیما کی اچانک مائیگریشن سے بھی مجھے کافی اچنبھا

ہوا تھا۔" اس کی خاموشی پر ہانی دوبارہ بولا "تمہیں تو پتا ہوگا کہ نیما نے شہر کیوں چھوڑ دیا؟"

"یہ تو تمہیں اس سے پوچھنا چاہیے۔" بظاہر شانے لاپروائی سے جھٹکتے ہوئے اس نے پھر اسے ٹالا۔

"وہ ملتی تو ضرور پوچھتا۔" ہانی کچھ جھنجھلا سا گیا۔

"چھوڑ یار رات گئی بات گئی۔ زندگی بہت ناقابل اعتبار قسم کی چیز ہے۔ وقت حالات کو حیرت انگیز اور جذبات کو ناقابل یقین حد تک بدل دیتا ہے نیما وقار گزری زندگی ـــــ کا ایک باب تھی جو اب میں نے بند کر دیا ہے۔ سو اس کا تذکرہ بھی بے کار ہے۔" اس نے اضطراری انداز میں آنکھیں سفید برف سے ڈھکی کیبنز پر جما دیں۔

"مگر تمہیں اس سے عشق تھا صہیب۔" ہانی نے تحیر سے پوچھا۔

"عشق؟" جواباً وہ ایسا فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا کہ ہوٹل سے باہر جاتے اور اندر کی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں نے قدرے دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"ارے بھائی میرے ہم اکیسویں صدی کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور تم عشق و محبت کی الف لیلوی داستان دہرانے میں مصروف ہو۔ عقل کے ناخن لو ہانی! یہ دور جس میں ہم تم زندہ ہیں بہت تیزی سے اپنی قدریں بدل رہا ہے محبت کی جگہ مادیت پرستی لے رہی ہے۔ یوں بھی پچاس فیصد محبت تو اس دنیا سے ختم ہی ہو چکی اور جو پچاس فیصد بچی ہے اسے اگر دنیا کی چھ ارب آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ہمارے حصے میں آئے گا ہی کیا کہ ہم کسی کو کچھ دے سکیں۔ تو مختصراً عرض یہ ہے کہ تم بھی احمقوں کی جنت سے باہر آ جاؤ اور مجھے بھی اسی دنیا کا باسی سمجھو جس کی قدریں کسی حد تک مجھ پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔"

دبی دبی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ خاصی غیر سنجیدگی بلکہ شوخی سے کہہ رہا تھا البتہ لہجہ بہت طنزیہ تھا۔ ہانی اس کی کاٹ محسوس کر کے لمحے بھر کے لیے لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں نیما وقار کا تعلق ایک ویل آف فیملی سے تھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تم بقول تمہارے مادیت پرستی کے کینسر میں مبتلا ـــــ ہو گئے ہو تب بھی تمہاری گھڑی ہوئی داستان میں کوئی سچائی محسوس نہیں ہوئی۔" اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے ہانی نے کہا تو وہ جبراً ہنس پڑا۔

"تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے ہارون علی جاہ! اور میرے ساتھ ایک ہاتھ نیما وقار کا بھی تھا جو بعد میں میری محبت سے صرف اس لیے دست بردار ہو گئی کہ میں اس کے کمشنر باپ کی نظر میں اہل قرار نہیں پا سکا تھا۔"

اپنے مخصوص انداز میں مضطربانہ انگلیاں بالوں میں پھیرتے ہوئے وہ بالآخر آج سچ بول ہی اٹھا۔

"کیا۔" ہانی کے لیے یہ اطلاع اتنی ہی حیرت آمیز اور تکلیف دہ تھی جتنی کہ خود اس کے لیے دو سال پہلے تک تھی۔ "مگر کیوں؟" کتنی ہی دیر بعد وہ بول سکا۔ اب تک وہ یہی سمجھتا تھا کہ صہیب حسن نے مردوں کو مخصوص "دل بھر جانے والی" عادت کے پیش نظر نیما وقار کو چھوڑ دیا ہے جبھی وہ دلبرداشتہ ہو کر شہر چھوڑ گئی مگر یہ تو اس کے فہم و ادراک سے قطعی بعید تھا کہ بات اس حد تک آگے جا کر ختم ہوئی تھی۔ اکثر طنزیہ اور کبھی شوخی سے صہیب کو کریدنے کی کوشش بھی کی مگر بے سود اس نے کچھ بتا کر نہ دیا۔

مگر آج جانے کیوں وہ راز جو اب تک وہ دل میں چھپائے پھر رہا تھا ہارون علی جاہ سے کہہ بیٹھا کہ دل پہ رکھا بوجھ کبھی تو اتارنا ـــــ ہوتا ہے۔

"کیوں؟" وہ یونہی مسکرا دیا اور اگلے لمحے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔ "یہ سوال تو میں نے نیما سے بھی نہیں کیا تھا ہارون کہ بعض سوالیہ نشان اس حد تک پھیلتے چلے جاتے ہیں کہ ہماری پوری ذات ان کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ اور جواب کا کشکول ہمیشہ خالی رہتا ہے یا پھر وہ سارے جوابات ہمارے ہی اندر کہیں بگولوں کی مانند چکرا رہے ہوتے ہیں اور ہم ان کو سمجھنے پر قادر نہیں ہوتے یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔"

"ریلیکس صہیب۔ آئی ایم سوری یار میں نے انجانے میں تیرے زخم کرید ڈالے۔" ہارون سخت نادم

نظر آرہا تھا۔ صہیب نے اپنی گردن گھما کر اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائیں تو بے ساختہ مسکراہٹ لبوں کو چھو گئی۔

"چلو جاؤ معاف کیا۔ آج تمہاری تسلی بھی ہو گئی کم از کم تمہاری تفتیش سے نجات تو ملی۔ سوال کر کر کے زندگی کو آزار بنا دیا تھا۔" وہ اسے پشیمانی کے حصار سے باہر نکالنے کو بظاہر ہنستے ہوئے بولا مگر لہجے میں چھپے ان دیکھے دکھ اور آنکھوں میں مخفی درد اپنی تمام تر شدتوں سے عیاں تھے۔

ہارون علی جاہ کے لیے یہ سمجھنا ہی دشوار تھا کہ محض ایک لڑکی کی جدائی اس حد تک صہیب حسن کے لہجے کو شکستگی سے دوچار کر گئی ہے۔ بات یقیناً کچھ اور بھی مگر وہ مزید کچھ پوچھ کر اس کا بھرم ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ضبط کہتا ہے خموشی میں بسر ہو جائے
درد کی ضد ہے کہ دنیا کو خبر ہو جائے

اگر درد سہنے والا خاموشی کی ردا اوڑھنے پر کمربستہ ہے تو چارہ گروں کو بھی چپ چاپ ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

"چلو آؤ۔ اندر چل کر گرم کافی پیئیں۔ تھوڑی دیر اور باہر رہے تو جسم کے اندر برف جم جائے گی۔" وہ ہانی کو لیے اندر آیا اور نیچے ہی ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر آرڈر دے دیا۔

"بائی دا وے یہ تمہیں میرے دل کی اس قدر پروا کیوں رہنے لگی ہے۔" کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی حائل رہی ہانی ابھی تک الجھی ڈور سلجھانے کی سعی لاحاصل کر رہا تھا کہ صہیب نے شوخی سے سوال کیا۔

"ہم اچھے دوست ہیں صہیب اور ایک دوست دوسرے کا خیال ضرور کرتا ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی اور متانت سے بولا۔

"ہاں یہ بات ماننے میں تو کوئی عذر مانع نہیں کہ ہم دوست ہیں مگر مجھے بات کچھ اور لگتی ہے۔" اس کے لہجے کو پراسرار بنایا تو ہانی نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب۔" وہ ٹھٹک گیا۔ صہیب کے چہرے کے تاثرات شوخی سے لبریز تھے۔

"مطلب یہ کہ وہ جو کہتے ہیں کہ

کسی کے دل کی بے چینی کسی کے دل کی بے تابی
وہی محسوس کرتا ہے جو خود بے تاب ہوتا ہے

تو مجھے شک ہے ہارون علی جاہ کہ تم کہیں "مبتلا" ہو گئے ہو۔" اس کا سر پر یقین انداز میں ہلا تو ہارون جھینپ کر ہنس پڑا۔

"صرف ہنسنے سے کام نہیں چلے گا مسٹر تمہیں اگلنا ہی ہو گا سب کچھ۔ ورنہ تو... میں ترکیب نمبر تیرہ اختیار کروں گا۔" وہ اسے وارننگ دیتا مکا لہرا کر بولا تو ہارون نے اس کی توجہ ذرا فاصلے پر بیٹھی دو لڑکیوں کی طرف مبذول کرائی جو ان کی گفتگو کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

"آئی ڈل سی یو ہارون علی۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا تو ہانی نے لاپروائی کے مظاہرے کے طور پر نظر ادھر ادھر گھمانا شروع کر دی۔

کوئی اس سے جا کے پوچھے اسے کیا ملا بچھڑ کے
وہ بھی خاک چھانتا ہے میں بھی خاک چھانتا ہوں

مری سے اسلام آباد تک کا راستہ باتوں میں پتا نہ چلا مگر اسلام آباد کی زمین پر قدم رکھتے ہی اسے نیما وقار کا خیال اپنے شکنجے میں جکڑ گیا تھا۔

پچھلے ہی سال تو وہ ماموں جان کے ساتھ یہاں آیا تھا اور نیما کو یہاں کی کنسٹرکشن کمپنی میں ایگزیکٹیو کی پوسٹ پر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا جو بھی تھا اس نے اپنے والد کی بات مان کر ان کا مان رکھ لیا تھا مگر اکیلی تو آج وہ بھی تھی صہیب حسن کی طرح۔

صہیب کی خاموشی اور چہرے کے گمبھیر تاثرات ہارون سے مخفی نہ تھے گو کہ وہ بظاہر انجان بنا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا مگر اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ صہیب اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

آب پارہ اور دامن کوہ کا حسین اور سحر انگیز نظارہ بھی صہیب کے جمود کو نہ توڑ سکا تو دو دن بعد ہی ہانی نے رخت سفر باندھ لیا۔

"ارے اتنی جلدی؟" وہ واش روم سے باہر نکلا تو ہانی کو سامان پیک کرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تولیہ اٹھا کر بال خشک کیے اور سوالیہ چہرہ لیے ہانی کے پاس چلا آیا۔

"ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم کافی دن یہاں رہ لیے ہیں۔ ویسے بھی تم تو یوں بھی میرے ساتھ نہیں ہوتے اکیلے گھومنے کا پروگرام ہوتا تو میں تمہیں گھسیٹتا ہی کیوں۔" اس کا انداز قدرے شکایتی تھا۔ صہیب پشیمانی سے لمحے بھر کے لیے چپ ہوگیا۔

"آئی ایم سوری ہانی۔ شاید میں ہوم سک ہو رہا ہوں۔ اسی لیے تمہیں ٹھیک سے کمپنی نہیں دے پا رہا۔" وہ خود سے عاجز تھا۔

"ہاں تو بس ٹھیک ہے۔ اب کراچی واپس چلتے ہیں۔ رزلٹ کا پتا چل جائے تو میں جلد ہی پشاور چلا جاؤں گا۔" ہانی نے فیصلہ سنا دیا۔ اپنے گھر جانے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

"ہوں پشاور۔" اس نے شرارت سے ہنکارا بھرا۔ ہانی نے چونک کر نظر گھمائی۔ "بائی دا وے وہاں کون کون تمہارا منتظر ہے۔" برش اٹھا کر بالوں میں پھیرتے ہوئے آئینے میں ہانی کو دیکھا۔

"بابا جان، بی بی، بڑے لالہ اور چھوٹی بہنیں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"نہیں۔" وہ مڑا۔ لبوں میں دبی مسکراہٹ دیکھ کر ہانی اس کی بات سمجھتے ہوئے بولا۔

"او بابا ایسا کچھ نہیں۔ اگر ہوتا تو تجھے ضرور بتاتا۔" اس نے سوٹ کیس زوردار آواز سے بند کیا۔

"ارے یہ وارداتیں بڑی خاموشی سے ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو ان کی خبر دوسروں کی زبان ہوا کرتی ہے میں کہتا ہوں اب بھی خود کو ٹٹول لو۔ مجھے تمہارے تیور خاصے "عاشقانہ" نظر آتے ہیں۔" وہ اب بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آرہا تھا۔

پشاور کے سنے علاقے سے تعلق رکھنے والا ہارون قدرے سادہ اور طبعاً شرمیلا تھا۔ اکثر ہی صہیب اسے زیر عتاب رکھتا۔

"بکومت۔" اس نے ایک زوردار دھپ اس کے شانے پر جمایا۔ اور انٹر کام پر ناشتے کے لیے آرڈر دے دیا۔

واپسی پر سامان پہلے سے تین گنا ہو چکا تھا کراچی سے چلتے ہوئے ان کے پاس صرف سفری بیگ تھا مگر اب انہوں نے دو سوٹ کیس خریدے تھے۔

"یار! یہ سب سامان تو گناہوں کے بوجھ کی طرح بے حد وزنی ہے۔" ایئرپورٹ پر کسٹم سے فارغ ہو کر وہ دونوں باہر آئے تو باقاعدہ ہانپ رہے تھے۔ صہیب نے غصے سے سامان کو گھورا۔

"اپنے اپنے اعمال ہیں ڈیئر، ورنہ مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوا۔" ہانی نے جوابی جملہ کسا تو وہ اچھا خاصا بھنا گیا۔

"ظاہر ہے تم تو ہو اوّل نمبر کے کنجوس۔ اور پھر تمہاری فیملی بھی اتنی بڑی نہیں۔"

"بیٹا جی! ابھی تو آپ کی ذاتی فیملی کا خانہ خالی ہے۔ جب وہ بھی فل ہوگا تب دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔" جانے کیوں ہانی کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔

"اچھا تمہیں زیادہ پیشین گوئیاں کرنے کی ضرورت نہیں۔ باہر چل کر ٹیکسی روکو۔"

"نہیں، میں نہیں جا رہا کنوینس کا انتظام کرنے۔ تم جاؤ میں تمہارا سامان بھی لے کر آتا ہوں۔" اس کے بگڑتے موڈ کو دیکھ کر ہانی نے جلدی سے جملہ مکمل کیا۔

"کیوں بھائی تم کیا کراچی میں قدم رکھتے ہی ہرکولیس بن گئے ہو، یا "اٹلس"۔" صہیب کا انداز تشویش لیے ہوئے تھا۔

"نہیں جی، ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ نہ تو میں ہرکولیس ہوں اور نہ اٹلس، کیونکہ ہرکولیس تو ایکسٹرا اسٹرانگ تھا، جبکہ اٹلس کو عشق کرنے کے جرم میں زمین اپنے کندھو پر اٹھانے کی سزا دی گئی تھی، جو کہ بقول یونانیوں کے وہ آج تک بھگت رہا ہے جبکہ میرا اس "مجرمانہ فعل" میں مبتلا ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔" ہارون نے گردن نفی میں ہلاتے ہوئے واشگاف لفظوں میں اعلان کیا۔

"دیکھ بڑا بول نہ بول ہانی! ایمان سے کسی دن شہید ہو جائے گا۔" وہ جگہ اور موقع محل دیکھے بغیر لوٹنے میں مصروف تھے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

"لہٰذا جب ایسا ہوا تب دیکھ لیں گے۔" ہانی ہنوز مطمئن تھا۔

"شرم کرو اقبال نے یہ شعر اس لیے نہیں کہا تھا۔" اس نے فوراً اسے لتاڑا۔

"تو شہید کی اصطلاح بھی ایسے مقتولین کے لیے استعمال نہیں ہوتی۔" جوابی فائر ہوا۔

"تمہیں تو میں گھر چل کر دیکھوں گا۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھا کہ اچانک ہی وقت گزرنے کا احساس ہوا تھا اسے۔

"ابھی دیکھ لو اب بھی کچھ حرج نہیں۔" پیچھے سے ہانی کی چہکتی آواز سنائی دے رہی تھی۔

والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے کی خوشی تھی شاید اسی لیے اس کا موڈ بہت فریش تھا۔ آج کل اس کے گھر والے پشاور سے کراچی شادیاں اٹینڈ کرنے آئے ہوئے تھے، اسی لیے وہ صہیب کے ساتھ واپس یہاں آگیا تھا ورنہ پروگرام تو وہیں سے پشاور جانے کا تھا۔ گھر فون کیا پتا چلا کہ سب یہیں آئے ہوئے ہیں۔ تو خود بھی یہیں چلا آیا۔ جہاں اس کا قیام اپنی پھپھو کے گھر تھا۔

ہارون کے بے حد اصرار کے باوجود وہ سیدھا گھر آگیا کہ اتنے دن گھر سے دور رہ کر وہ بہت اکتا گیا تھا۔ آنے کی چونکہ کسی کو خبر نہ کی گئی تھی، لہٰذا کوئی ریسیو کرنے نہیں آیا تھا۔

گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے اس نے اندر نظر دوڑائی تو لان خاموش نظر آیا۔ گویا کہ سب لوگ اندر یا تو لنچ میں مصروف تھے یا پھر استراحت کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

"چاچو۔!" وہ سوٹ کیس اٹھا کر لاؤنج میں داخل ہوا تو اسریٰ کی آواز پر سب اس کی آمد سے بیک وقت مطلع ہوئے۔

"چاچو کی جان۔" اس نے بازو پھیلا دیے اور سات سالہ اسریٰ پہلی فرصت میں اس کے گلے سے آلگی۔ اسریٰ کے پیچھے پیچھے حمزہ تھا۔

"صہیب! تم آگئے، اطلاع کیوں نہیں دی۔ اُف کتنے دنوں بعد شکل دیکھی ہے۔" متفرق جملے اس کی سماعت سے ٹکرائے۔

آج تو بشریٰ باجی بھی آئی ہوئی تھیں، مامی جی، بھابی، بڑے بھیا اور زمان بھائی سب موجود تھے، اس کی آمد پر حسبِ توقع نہایت گرمجوشی کا اظہار ہوا۔ اسی محبت نے تو اسے ان دیکھی ڈوروں سے باندھ رکھا تھا۔

"اتنے بے مروت ہو، ایک بار بھی یہاں فون نہیں کیا تم نے۔" بھابی اور بشریٰ باجی کی شکایت برحق تھی، وہ سر کھجا کر بھیا کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کے ذریعے ہی گلو خلاصی ہو سکتی تھی، مگر وہ بھی اہلیہ اور ہمشیرہ کے ہمنوا تھے۔

"آئی ایم سوری یار! ایمان سے قطعی خیال نہ رہا۔" وہ شرمندہ ہو گیا۔

"امی سے معافی مانگو جو دعائیں مانگ مانگ کر ہلکان ہوتی رہی ہیں۔" بشریٰ باجی نے فاصلے پر بیٹھی شگفتہ بیگم کی طرف اشارا کیا، جو ناراضگی کے اظہار کے طور پر اسے بالکل نظر انداز کیے بیٹھی تھیں۔

"مامی جی تو ناراض لگ رہی ہیں۔" اس نے قدرے سہم کر پوچھا۔

"جی۔ اور اب آپ کو انہیں منانا پڑے گا جبھی سب تمہیں معاف کریں گے، نہیں تو پھر جرمانہ بھرنا۔" بھابی نے اسریٰ کو گود میں بٹھاتے ہوئے مزے سے کہا۔

"پلیز سیلپ می۔"

"سوری۔" سب نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "دیکھ لوں گا میں آپ سب کو۔" وہ دھمکیاں دیتا اٹھ گیا۔

"مامی جی۔" ناچار وہ خود اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" نظریں چرا کر سوال کیا، مگر جواب ندارد تھا۔

"آئی ایم ویری سوری۔" ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"سوری کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے بیٹا!" شگفتہ بیگم شکوہ کناں لہجے میں بولیں۔ "یہاں کون سی تمہاری سگی ماں پریشان بیٹھی تھی، جو تمہیں خیال ہوتا۔ ماموں ممانی اتنی اہمیت تو نہیں رکھتے کہ انہیں کم از کم اپنی خیریت سے ہی آگاہ کیا جائے، تم آگئے کیا یہ احسان کم نہیں۔" وہ سخت نالاں تھیں، گلہ آمیز لہجہ اور آنکھوں میں چمکتے محبت کے قطرے۔ وہ نادم ہو گیا۔

"پلیز مامی جی! ایسا نہ کہیں۔ میں نے کب آپ کو اپنی ماں سے جدا جانا ہے۔ آپ ماموں جان اور یہ سب لوگ

ہی تو میرے اپنے ہیں، میرے جسم میں دوڑتے لہو میں آپ سب کی محبت شامل ہے۔ خدا گواہ ہے مامی جی! کہ آپ سب کی چاہتیں ہی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں ورنہ۔" جانے وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔ بعجلت ہونٹ بھینچ لیے۔

"یہ تم نے کیا کہا صہیبی۔" شگفتہ بیگم تڑپ گئیں۔

"تمہیں کس بات کا غم ہے بیٹا!"

"کوئی غم نہیں مامی جی۔" اس نے خود کو سنبھالا۔

"پھر تم نے ایسا کیوں کہا صہیب۔" بھیا بھی اب کے بولے۔ زمان بھائی اور بشریٰ باجی کے چہروں پر بھی یہی سوال تھا۔ بھابی اور بچے البتہ خاموش اور قدرے حیران بیٹھے تھے۔

"بس یونہی زبان سے پھسل گیا۔ کم آن۔ آپ سب اسے دل پر کیوں لے بیٹھے، آخر کو زبان ہے پھسل جاتی ہے کبھی کبھی۔" وہ جبراً مسکرایا۔ "خیر یہ بتایئے ماموں جان کہاں ہیں۔ اور پلیز بھابی کھانا منگوائیں مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" اس نے فٹافٹ سب کی توجہ ادھر ادھر مبذول کرائی۔

مگر شگفتہ بیگم کے دل میں تو جیسے ایک جملہ ترازو ہو گیا تھا۔

"پاپا آج آفس سے دیر سے آئیں گے، ویسے وہ بھی تم سے کم ناراض نہیں۔" زمان بھائی نے اطلاع دی۔

"ارے انہیں منانا کون سا مشکل کام ہے۔ دیکھا آپ نے کیسے مامی جی کو لائن پر لایا ہوں۔" وہ زمان کی طرف جھک کر شرارت سے کالر اونچا کرتے ہوئے بولا۔

"بس رہنے دو تم۔ آج پاپا سے ڈانٹ پڑے گی تب دیکھوں گی تمہیں۔" بشریٰ باجی ہنس کر بولیں۔ "تو وہ دیکھ لیں گے" کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بھابی کے پیچھے ہی کھانا کھانے کے لیے چلا آیا۔

وہی کمرہ تھا اور وہی سامان کی مخصوص ترتیب۔ اب تو اسے ان سب چیزوں سے بھی محبت ہو چلی تھی، کتنا سکون سا محسوس ہوتا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں۔ اپنی تنہائیوں سے اپنی ذات میں انگڑائیاں لیتی اذیتوں کو شیئر نہیں تو کیا تھا اس نے۔

ان خاموش دیواروں کے سوا کون جانتا تھا کہ اس کے اندر کیسے درد پنپنے لگے ہیں۔ کتنے آنسوؤں نے وجود کی فصیلوں کو سیلن زدہ کر رکھا ہے، حقیقت کی برہنہ تلواروں نے احساس کے ان گنت ٹکڑے کیے تھے۔

بستر پر لیٹا تو نیند نے نہایت خاموشی سے آلیا۔

اور جانے کب تک وہ سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔

"اوہ ماموں جان آگئے ہوں گے۔" اٹھتے ہی پہلا خیال آیا لہٰذا ایک ہی جست میں وہ واش روم کے اندر تھا۔ فٹافٹ منہ دھویا اور باہر نکل آیا۔

لان میں شام کی چائے پی جا رہی تھی، وہ بھی مسکراتا ہوا وہیں چلا آیا۔

"السلام علیکم ماموں جان!" بڑھ کر سب سے پہلے ماموں جان کو سلام کیا۔

جواب ندارد تھا۔ سب کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ اسے خجل کر گئی۔

"میں سخت شرمندہ ہوں ماموں جان! آئندہ ایسی کوتاہی ہرگز نہیں ہوگی۔ اب جہاں جاؤں گا آنے اور جانے کے اوقات آپ کی خدمت میں عرض کر کے جاؤں گا، نیز وہاں سے بھی خیریت کی اطلاع بھجواؤں گا۔ لیجیے کان پکڑتا ہوں۔" اس نے رٹو طوطے کی طرح مخصوص لب و لہجے میں بول کر جھٹ کان پکڑ لیے۔ سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

"بہت پریشان کرتے ہو صہیب، پھر چاہتے ہو کہ تمہیں معاف بھی فوراً کر دیا جائے۔" احسان صاحب نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ لہجے میں گلہ بھی تھا اور محبت بھی۔

"کیا کروں آپ تو جانتے ہیں کہ میں بہت بے صبرا واقع ہوا ہوں۔" اس نے شوخی سے ہنستے ہوئے سر کھجایا۔ تو انہیں مانتے ہی بنی۔

بھانجے کی محبت گزری ساعتوں کی ناراضگی پر غالب آگئی۔

"کیسے ہو، کیا کیا کرتے رہے اتنے دنوں۔" اس کے سر پر محبت سے دستِ شفقت پھیر کر وہ اس کے ٹور کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

اس نے فاتحانہ نظر سب پر ڈالی اور ہنستے ہوئے اپنا مگ تھام کر ماموں جان کی باتوں کا جواب دینے لگا۔

رزلٹ آؤٹ ہوئے کافی دن گزر چکے تھے، دونوں نے جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ دونوں ہی فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو گئے تھے۔

ہارون کی فیملی پشاور جا رہی تھی سو وہ بھی صہیب سے مل کر اپنے شہر روانہ ہو گیا۔ جاتے جاتے بہت ضد اور اصرار کر کے گیا کہ جلدی ہی صہیب اس سے ملنے پشاور آئے گا، اور اسے بھی ماننے ہی بنی۔

شام کی ٹھنڈی ہوا ابھی چلنی ہی شروع ہوئی تھی۔ دھوپ کی تپش کم ہوئی تو اسے اپنی اکلوتی بائیک کی حالتِ زار کا خیال آیا جو اس کی جدائی میں پورچ میں کھڑے کھڑے مٹی سے اَٹ گئی تھی۔

لان کا پائپ لگا کر ابھی اس نے انتہائی انہماک سے دھلائی شروع ہی کی تھی کہ گیٹ پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے توجہ دیے بغیر کام جاری رکھا، مگر جب دوسری بلکہ تیسری بار بھی اتنے ہی صبر کے ساتھ دستک جاری رہی تو اُسے دروازہ کھولتے ہی بنی۔

"جی فرمائیے۔" جینز کے پائنچے اُلٹائے، آستین فولڈ کیے ایک ہاتھ میں پائپ لیے وہ خاصی کرختگی سے بولا۔

"وہ دراصل میں مناہل ہوں" نو وارد اس کے انداز پر کافی گھبرا سی گئی۔

"سو واٹ۔" اسے جانے کیوں جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔

"میں اسریٰ کی ٹیچر ہوں۔ پلیز اسے بتا دیجیے کہ میں آئی ہوں۔" اس بار قدرے اعتماد سے جواب آیا۔

"آپ۔۔۔؟" وہ بلاشبہ حیران ہوا۔

سامنے کوئی کرخت قسم کی استانی نہیں بلکہ ایک شگفتہ سی لڑکی کھڑی تھی۔ آسمانی بلو شلوار سوٹ پر بڑا سا ہم رنگ دوپٹہ سر سے لپیٹے الماوی نقوش والی مناہل اسے یقیناً چونکا گئی۔

"اوہ آپ تشریف لائیے۔" وہ راستہ چھوڑتے ہوئے مہذب اور شائستہ انداز میں بولا۔ لہجے میں اپنے چند ثانیے پہلے والے رویہ پر ندامت بھی تھی۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر چلا آیا۔

"اسریٰ، چلو تمہاری میڈم آئی ہیں عربی کا قاعدہ نکالو جا کر۔" اسریٰ اسے لونگ روم میں ہی مل گئی، وہیں سے پکار کر کہا۔

"چاچو! میری تو کوئی استانی نہیں ہیں۔" موٹی موٹی آنکھیں حیرت سے گھماتی اسریٰ اس کے پاس ہی چلی آئی۔

"کیا مطلب؟" وہ اچنبھے سے گویا ہوا۔ "مگر وہ محترمہ تو تمہیں ہی بلا رہی ہیں۔" جھک کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"کون آیا ہے صہیب۔" بھابی پیچھے سے چلی آئیں۔

"اسریٰ کی استانی۔ قرآن شریف پڑھانے آئی ہیں۔"

"کیا؟" وہ حیران ہوئیں۔

"کوئی مناہل صاحبہ ہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔ گویا کہ کسی کو خبر ہی نہیں تھی، جبکہ وہ محترمہ انتظار کر رہی تھیں۔

"مناہل۔" بھابی نے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

"بے وقوف وہ اسریٰ کی ٹیوٹر ہے۔ انگلش اور میتھس پڑھاتی ہے اسے۔"

"ریئلی۔ مگر ان کا آؤٹ لک تو بالکل ایسا ہی تھا۔ جیسے کسی مدرسے سے نکل کر آ رہی ہیں۔" اس نے اپنی حیرانی کو الفاظ دیے۔

"دیکھ لو۔ آج کل کے دور میں بھی ایسی لڑکیاں ہیں جبکہ ماں اس کی اٹلی کے کسی ہوٹل میں جز وقتی سنگر تھی۔" وہ حسبِ معمول اس کی حیرتوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔ "چلو بیٹا! جاؤ تمہاری ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے۔ حمزہ کو بھی بلاؤ کہو کہ اٹاری بند کر دے اب۔" انہوں نے اسریٰ کو اندر دوڑایا۔

"میں ذرا مناہل سے مل لوں، آج پورے ہفتے بعد آئی ہے، جانے انکل کی طبیعت اب کیسی ہے۔" بھابی متفکر سی کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔ تو وہ بھی شانے اچکاتا باہر آ گیا۔ جہاں اس کا کام ادھورا پڑا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں ہی یہ نئی ٹیوشن رکھی گئی تھی۔ بھابی کے انداز سے لگ رہا تھا، جیسے وہ اس کے خاندان سے بھی واقف ہوں۔ وہ کام نپٹاتے ہوئے سوچنے لگا تو پھر خود ہی سر جھٹک کر سارے خیالات ذہن سے نکال دیے۔

بائیک دُھل کر چمک رہی تھی، اسے دیکھ کر تو خواہ مخواہ ہی ڈرائیو کا دل چاہنے لگا تو وہ شاور لے کر باہر نکل آیا۔

وائٹ ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں ہمیشہ کی طرح اسمارٹ لگ رہا تھا وہ۔ گیٹ تک آیا تو مناہل باہر نکلتی نظر آئی۔ ٹیوشن کا وقت ختم ہو گیا تھا۔

اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی اور پھر سر

پھر دوپٹہ جماتے ہوئے گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔

"کمال ہے؟" وہ اس کے سراسیمہ سے انداز پر بے اختیار مسکرا دیا۔ بائیک اسٹارٹ کر کے سڑک پر لایا تو وہ تین چار گھر چھوڑ کر سفید گیٹ والے بنگلے میں جاتی نظر آئی۔ بھابی کی معلومات کی وجہ اب سمجھ میں آئی تھی کہ وہ ان کی پڑوسی بھی تھی۔ یوں بھی انہیں لوگوں کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا بلا وجہ ہی شوق تھا جس کا اظہار اکثر و بیشتر ان کی گفتگو سے ہوتا رہتا تھا۔

وہ کافی دیر بعد مٹر گشت کر کے گھر پہنچا تو بشریٰ باجی موجود تھیں۔ جو کہ خاصی تیاری سے آئی ہوئی تھیں بلکہ دوسروں کو بھی جلدی کرنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔

"ہیلو۔ کیا کہیں جانے کا پروگرام ہے؟" وہ کی چین گھماتا وہیں چلا آیا، جہاں بشریٰ باجی بیٹھی تیزی سے زمان بھائی کو احکامات دے رہی تھیں۔

"ہائیں۔ گویا کہ آپ بھی لاعلم ہیں۔ کمال ہو گیا ہے" وہ بری طرح چڑ گئیں۔ "جب سے آئی ہوں۔ ایک ایک کو یاد دلا کر تھک گئی ہوں، کہ آج چچا جان کے یہاں جانا تھا، زمان کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے سلسلے میں صبح میں نے فون پر امی اور بھابی کو یاد دہانی بھی کرائی تھی مگر یہاں پہنچی ہوں تو یہ حال کہ کسی کو خبر ہی نہیں۔"

"اوہ۔" اس کے ہونٹ سیٹی کی صورت وا ہوئے۔

"اب اگر تمہیں بھی کچھ تیاری کرنی ہے تو پلیز جلدی کرو۔ تھوڑی دیر میں ساجد آ جائیں گے۔ جبکہ ابھی تک کوئی تیار ہی نہیں۔" وہ بہ منت بولیں۔

"ساجد بھائی گئے کہاں، کیا آپ اکیلی آئی ہیں؟"

"نہیں وہ مجھے ڈراپ کر کے یہیں قریب میں کسی کام سے گئے ہیں۔ اچھا تم تو اٹھو اب۔" بات مکمل کر کے اسے کھینچ کر اٹھانے کی ناکام کوشش کی۔

"افوہ بابا۔ مجھے کون سا پرنس آف ویلیز لگنا ہے، بس یونہی ٹھیک ہوں۔" اس نے کسلمندی سے پیر پسارے۔

"ہوں، یہ تو ہے۔" بشریٰ باجی شوخی سے مسکرائیں تو جواباً وہ انہیں انگوٹھا دکھاتا اٹھ گیا۔ برش کر کے پرفیوم لگایا، بلکہ بقول بھابی خود پر انڈیلا اور باہر نکل آیا۔

زمان بھائی بڑے نک سک سے تیار نظر آئے تو اس کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔

ع۔ ہم تو چلے سسرال کہ ہم تو دولہا ہو گئے

انہیں دیکھ کر شوخی سے گنگنایا، مگر وہ بھی کہاں چپ رہنے والے تھے، فوراً جوابی جملہ کہا۔

ع۔ آپ یہ سن کر کس لیے آگ بگولہ ہو گئے

"لو جی۔ یہ کیوں ہوگا آگ بگولا۔ اس کے تو خود سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں۔" بشریٰ بھابی محبت سے انہیں دیکھتی وہیں آ گئیں اور ساتھ ہی ایک دھماکے دار خبر بھی نشر کر ڈالی۔

"ریئلی۔" زمان بھائی کا انداز مسرت آمیز تھا۔

"واٹ۔" جبکہ وہ بری طرح بدکا۔ "ربش بکیا فضول بکواس ہے۔"

"صہیب۔" بشریٰ باجی اور زمان دونوں اس کے تیور پہ ششدر رہ گئے۔ "آر یو آل رائٹ۔" زمان نے ٹھنڈے لہجے میں کہتے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھا، جبکہ وہ باقاعدہ غصے سے کھول رہا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" وہ اکھڑا اکھڑا سا لگ رہا تھا۔

"باجی نے شاید مذاق کیا تھا تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے۔" زمان اسے کول ڈاؤن کرنے میں لگے تھے جبکہ اس کا ٹمپر لوز ہو چکا تھا۔

"ویسے تمہارا پرابلم کیا ہے صہیب۔ آخر تم بتاتے کیوں نہیں۔" بشریٰ باجی حد درجے سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر ان کی استفہامی نظروں میں دیکھا اور اضطراری انداز میں بالوں میں انگلیاں پھنسا کر نظر چرائی۔

"میں نے تو صرف تمہاری شادی کا ذکر کیا تھا۔ اور تم تو یوں بدکے، جیسے تمہیں کالے پانی کی سزا سنائی جا رہی ہو، آخر تم اتنے الرجک کیوں ہو گئے ہو شادی سے۔" وہ تو سارے سربستہ راز آج ہی جاننے پر تلی ہوئی تھیں۔

"پلیز بشریٰ باجی، ہم اس ٹاپک پر پھر کبھی بات کریں گے۔" بمشکل خود کو دھیما رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ اور پلٹ کر جانے لگا۔

"نہیں آج ہی بتاؤ۔" ہاتھ پکڑ کر اسے روکا اور بہت استحقاق سے سوال کیا۔

"زمان بھائی، پلیز آپ انہیں سمجھائیں کہ خواہ مخواہ آپ کی خوشی کو کرکرا نہ کریں۔" وہ سنگین لہجے میں بولا۔ تو وہ دونوں متفکرانہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

آج نہیں تو کل اسے بتانا ہی تھا کہ وہ ایسا کوئی رشتہ نہیں جوڑ سکتا، جو اس کے زخموں کو ادھیڑ ڈالے

اس کے ماضی سے ندامت کی پرچھائیاں پھر سے سامنے لا کھڑی کرے۔

"چلیں بھئی ہم تو تیار ہو گئے۔" بھابی بچوں سمیت ایک دم فرسٹ کلاس تیاری کے ساتھ آ گئی تھیں۔

"خیریت آپ لوگ کیا صہیب کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے ہیں۔" قریب بیٹھنے پر ان سب کے چہروں پر نظر ڈالی، اور غیر معمولی کیفیت محسوس کر کے وہ بے اختیار کہہ اٹھیں۔

"دیکھ لیجیے میری وجاہت کا عالم۔" سب سے پہلے اس نے خود کو سنبھالا۔ جبراً مسکراہٹ لبوں پر سجائی اور شوخی سے بولا۔

"جی۔ ایسے ہی تو آپ یوسف ثانی ہیں۔" وہ چھیڑنے کی خاطر بولیں۔

"بس آپ جیسے لوگوں کا حسنِ نظر ہے، ورنہ بندہ کس قابل ہے۔" جھک کر کورنش بجا لایا۔ بشریٰ اب تک خاموشی سے اس کے بدلتے موڈ کو استعجاب سے دیکھ رہی تھیں۔

"آج موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار لگ رہا ہے بھائی۔ آج تو تمہارا ہی دن ہے۔" بھابی نے کھنکتے لہجے میں اسے چھیڑا تو اُس نے لب سختی سے بھینچ لیے۔ ماحول میں یکدم جامد سناٹا اُتر آیا۔ اس نے ایک نظر ان سب پہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

لان میں مامی جی اور ماموں جان ان سب کے انتظار میں کھڑے باتیں کر رہے تھے، وہ ان کے پاس آیا اور باتوں میں لگ کر اپنا دھیان بٹانے لگا۔ ذرا دیر بعد ساجد بھائی بھی آ گئے تو سب چھوٹے ماموں کے گھر چلے گئے۔

زمان بھائی کی منگنی چھوٹے ماموں کی بڑی بیٹی منزہ سے دو سال پہلے طے ہوئی تھی، اور اب شادی کا پروگرام تھا۔ اسی سلسلے میں آج وہ سب یہاں جمع ہو رہے تھے، وہ بھی سب کی خوشی میں خوش ہو کر ـــــــ یہاں آیا تھا۔ گو کہ بشریٰ باجی اور بھابی کی چھیڑ چھاڑ نے اس کے کان کھڑے کر دیے تھے، البتہ اس وقت وہ بہت نارمل انداز میں سب کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اندر زمان اور منزہ کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے ساتھ ساتھ عنیزہ کے لیے اس کا پرپوزل بھی دیا جا رہا ہے۔

"لگتا ہے آج ہی ساری باتیں طے کر لی جائیں گی۔" ساجد بھائی نے گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا، اور زمان کو شوخی سے دیکھا، کافی دیر ہو چکی تھی، سب لوگ اندر جانے کیا کیا طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

"میں دیکھتا ہوں اندر کون سا 'معاہدہ' طے کیا جا رہا ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر اٹھا اور ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

"دیکھیے احسان بھائی، منزہ آپ کی امانت تھی اور اب بھی ہے آپ جب چاہیں اسے لے جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر عنیزہ کے لیے ہمیں صہیب کا رشتہ قبول نہیں۔" چھوٹی مامی کا سخت لہجہ اور جملہ اسے باہر ہی منجمد کر گیا۔ بڑا دو ٹوک انداز تھا ان کا۔

"مگر کیوں؟" سراپا احتجاج مامی ہی تھیں۔

"اصل میں بھابی جان، عنیزہ کے دو تین اور بھی رشتے آئے ہوئے ہیں۔" فیضان ماموں نے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے مامی جی کو مخاطب کیا مگر چھوٹی مامی نے انہیں ٹوک دیا۔

"فیضان بات کو گھما پھرا کر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ہمیشہ کے خودسر لہجے میں انہوں نے شوہر کو مزید بولنے سے روکا اور پھر گویا ہوئیں۔ "میں لگی لپٹی رکھنے کی قائل نہیں احسان بھائی! لہٰذا صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ اپنی بیٹی ایک بدنام اور پیشہ ور دہشت گرد اور قاتل کے بیٹے کو نہیں دے سکتی۔"

"زہرہ بیگم۔" فیضان ماموں نے کمزور لہجے میں انہیں ٹوکا جس کا کہ انہوں نے نوٹس لینا ضروری نہیں سمجھا۔

"مگر صہیب صرف رومی حسن کا تو بیٹا نہیں ہے زہرہ، میری بہن سے بھی تو تعلق ہے اس کا۔ پھر میں نے اور شگفتہ بیگم نے بہت احتیاط سے پرورش کی ہے اس کی۔" ماموں جان کا لہجہ شکستہ تھا۔

"وہ سب اپنی جگہ احسان بھائی، مگر خون کا اثر کبھی نہیں جاتا۔ تخم کی تاثیر صحبت کے اثر پہ ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ جس طرح رومی حسن نے میمونہ کو بے وقوف بنا کر شادی کی اور ساری دولت ہتھیا کر گھر سے نکال دیا، کون جانے کہ صہیب ایسا نہیں کرے گا۔ کیا آپ اس کی گارنٹی دے سکتی ہیں کہ صہیب پر اپنے باپ کے گندے خون کا رنگ نہیں چڑھے گا۔ میمونہ کی شرافت اور پاکدامنی اگر شادی جاتے تو صہیب کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے۔" زہرہ بیگم کا ایک ایک لفظ زہر

میں بجھا تھا۔

باہر کھڑے صہیب حسن کی نس نس میں جیسے چنگاریاں بھر گئیں۔ باپ کے نام کی گالی ہمیشہ ہی اس کی زندگی کی سفید چادر پر کالک بن کر اس کا منہ چڑاتی رہی تھی، اور اب تو یہ کالک دھیرے دھیرے اس کے پورے وجود کو کھائے جا رہی تھی۔

"زہرہ خدا کے واسطے اپنے الفاظ واپس لے لو، تم میری پرورش پر الزام لگا رہی ہو۔" مامی جی بری طرح تڑپ گئی تھیں۔ "میمونہ میری ہمدم اور ہمراز تھی، میں نے اس کے بیٹے کو اپنے کلیجے کا ٹکڑا بنا کر پالا ہے، اور آج تم نے میری ساری ریاضت پر پانی پھیر دیا۔" ان کا لہجہ رندھ گیا۔ کمرے میں موت کا سناٹا طاری تھا۔

"تو گویا یہ تمہارا بھی فیصلہ ہے فیضان۔" احسان صاحب نے قدرے توقف کے بعد بھائی کو گلہ آمیز نظروں سے دیکھا۔

"زہرہ بچیوں کی ماں ہے بھائی جان، اور بچوں کی خوشی میں ماں کی خوشی شامل ہونا چاہیے۔" فیضان صاحب نے دھیرے سے نظر چرالی۔

"یہ سب کہتے ہوئے مجھے احساس ہے احسان بھائی کہ شاید اب آپ منزہ کا رشتہ بھی توڑ دیں گے مگر یقین کیجیے میں ایک بیٹی کی خاطر دوسری کو جہنم میں جھونک نہیں سکتی۔" زہرہ بیگم اس بار دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔

"کم ظرفی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے زہرہ بیگم اور تم اب تک یہ نہیں جان سکیں کہ کم ظرفی ہمارے خاندان کا شیوہ نہیں۔" احسان صاحب کا چبھتا ہوا انداز انہیں بہت کچھ جتا گیا۔ "بہرحال جو بھی تاریخ آپ لوگ ٹھیک سمجھیں طے کر دیں، میں اب گھر جانا چاہوں گا۔" وہ یکدم بات مکمل کرتے ہی کھڑے ہو گئے۔

شگفتہ بیگم بھی بہت بددل سی لگ رہی تھیں بشریٰ اور بھابی جان الگ خاموش بیٹھی تھیں۔ والد کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مگر آپ لوگ کھانا تو کھایئے احسان بھائی۔" زہرہ بیگم نے بعجلت کہا۔ منزہ کے رشتے کی انہیں بے حد خوشی تھی، ورنہ ایک لمحہ پہلے تو وہ بالکل مایوس تھیں۔

"نہیں آج نہیں پھر کبھی سہی۔" وہ ایک منٹ بھی مزید رکنے کے روادار نہیں تھے۔

"پلیز بھائی جان! ناراض ہو کر نہ جائیں۔" فیضان

بری طرح شرمندہ تھے البتہ زہرہ بیگم اپنی ازلی ہٹ دھرمی سے کھڑی تھیں۔

"پلیز پاپا رک جایئے، صہیب اور ساجد بھی ہمارے ساتھ ہیں، اور انہیں یہ سب کچھ تو بتایا نہیں جا سکتا۔" بشریٰ باجی نے پشت سے باپ کے کندھے کو تھاما تو وہ گہرا سانس بھر کر رک گئے۔

"اوکے تم لوگ ذرا جلدی کرو میں باہر بیٹھتا ہوں یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔" احسان صاحب سپاٹ لہجے میں کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھر کر باہر نکلے تو پردہ ہٹاتے ہی سامنے کھڑے صہیب کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئے۔

اس کی ـــــــ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ ضبط کی کتنی منزلوں سے گزر رہا ہے۔ مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں اور نظریں جیسے شرارے چمک رہے تھے اس کی رگ رگ میں جیسے لاوا بہہ رہا تھا۔

"صہیب۔" وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھے۔

"مجھے اپنے دوست کے پاس جانا ہے ماموں جان، میں گھر پہنچ جاؤں گا، اللہ حافظ۔" اس کا تند لہجہ قطعی سپاٹ اور سرد تھا ـــــــ ان کا جواب سنے بغیر تیزی سے پلٹ گیا۔

"صہیب میری بات تو سنو۔" وہ پیچھے سے پکارے مگر اس کے کان تو جیسے سائیں سائیں کر رہے تھے، سوائے زہرہ بیگم کے انگاروں سے اٹے جملوں کی بازگشت کے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہ بہت برا ہوا۔" بشریٰ باجی نے گہری سانس بھری، احسان صاحب پلٹے تو وہ ان کے پاس ہی کھڑی نظر آئیں۔ "پاپا وہ بہت جذباتی ہے کہیں۔" انجانے خدشوں سے گھبرا کر وہ کچھ کہتے کہتے لب بھینچ گئیں۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔" احسان صاحب نے تھرتھراتا ہاتھ بیٹی کے سر پہ پھیر کر جانے خود کو تسلی دی

بمشکل چند لقمے زہر مار کر کے وہ سب بہت بددل ہو کر لوٹے۔ ماحول ہی ایسا تھا کہ کسی قسم کا جوش یا ولولے کا اظہار کرنے کا دل ہی نہ چاہا۔ زمان بھائی، ساجد اور بڑے بھیا اس گمبھیر صورتِ حال سے ناواقف تھے، لہٰذا خوش گپیوں میں مصروف رہے مگر ان کی خوش مزاجی بھی ماحول پر چھائے تناؤ کو کم نہ کر سکی اور آخر وہ سب لوگ

گھر آ گئے۔

صہیب اب تک نہیں لوٹا تھا، شگفتہ بیگم کے لیے یہ خبر ہی روح فرسا تھی کہ اس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ اب وہ اسے کس طرح سنبھالیں گی... یہی خیال پریشان کیے دے رہا تھا۔

رات کا ایک بج رہا تھا جب اس کی بائیک کی آواز سنائی دی، بیل بجنے سے پہلے ہی دروازہ شگفتہ بیگم نے بڑھ کر کھول دیا۔ وہ خاموشی سے بائیک اندر لے آیا۔

"تم کہاں تھے صہیبی۔" وہ لپک کر اس کی طرف بڑھیں۔

"آئی ایم سوری مامی! میں اپنے یونیورسٹی کے ایک دوست کے ساتھ ساحل تک چلا گیا تھا۔ یقین کیجیے بس وہ زبردستی گھسیٹ لے گیا۔" وہ بڑے نارمل لہجے میں بولتا ہوا ان کی جانب مڑا۔ احسان صاحب قدرے فاصلے پہ کھڑے اسے گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"تمہیں معلوم ہے ہم کس قدر پریشان تھے۔" وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

"بندۂ خطاکار معافی کا خواستگار ہے۔ سوری آنٹی۔۔۔ ایکسٹریملی ویری سوری۔" اس نے حسب معمول ان کے کندھے پر محبت اور ناز سے بازو پھیلا دیے۔

"بیٹا دوسروں کی خاطر اپنوں کا دل نہیں جلاتے۔" وہ زہرہ بیگم کا رویہ یاد کر کے آبدیدہ ہو گئیں لمحہ بھر کے لیے غصے سے اس کا چہرا سرخ پڑ گیا، مگر جلد ہی اس نے خود کو کنٹرول کر لیا۔

"اوکے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ویسے وہ میرا بہت اچھا دوست ہے، اس لیے اس کا کہا مان لیا ورنہ میں۔ دوسروں کا اتنا خیال بھی نہیں رکھتا۔" وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا۔ اور ان کو لے کر احسان صاحب کے پاس چلا آیا۔

"آپ سے بھی کچھ کہنا پڑے گا کہ گلو خلاصی یونہی ہو جائے گی۔" کان کھجا کر شرارت سے سوال کیا۔ اپنے ہر انداز سے وہ یہی جتا رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"رات کافی ہو گئی ہے تم جا کر آرام کرو۔" احسان صاحب نے ایک جملے میں ہی بات ختم کر ڈالی۔ اور اپنے کمرے کی جانب مڑ گئے۔ البتہ مامی اس کے پیچھے ہی چلی آئیں۔

"کھانا کھایا تم نے یا گرم کر دوں؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں وہیں ریسٹورنٹ میں کھا لیا تھا۔" جوگرز اتارتے ہوئے اس نے مزید جھوٹ بولا۔

"ٹھیک ہے، اب تم سو جاؤ۔" انہوں نے اس کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں پھیریں اور باہر چلی گئیں۔

نیند بھلا کیسے آتی۔ وہ یونہی کپڑے تبدیل کیے بغیر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ نیم تاریک کا زرد رو چاند بہت اداس لگ رہا تھا۔ ہلکی چاندنی میں سرسراتے پیڑوں کے سائے عجیب پژمردہ سے نظر آ رہے تھے، خود اس کی طرح تھکے اور آزردہ۔

رومی حسن کی خطاؤں کا سزاوار وہ کیوں گردانا جاتا ہے؟ آخر اس کا قصور کیا ہے؟ محض یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی اولاد ہے جس نے معاشرے کو اذیت کے سوا کچھ نہیں دیا۔ مگر دیا تو اسے بھی کچھ نہیں سوائے بے گناہ بدنامی اور بلاتقصیر سزا کے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ اس کا نام جوڑ کر اس پر بھی تو زندگی اور خوشیوں کا دروازہ بند کر گیا تھا۔

تو پھر اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی کیوں نہیں۔۔۔

نیما ذوفار کے کمشنر باپ نے اس سے ملنے کے بعد جب اس کے بارے میں انکوائری کرائی اور یہ معلوم کیا کہ وہ رومی حسن کا بیٹا ہے اس نے بھی اتنے ہی تحقیر آمیز لہجے میں اسے اس کی حیثیت جتائی تھی۔

"کہاں تم بدنام پیشہ ور قاتل کے بیٹے اور کہاں میری کمشنر ذوفار بلگرامی کی بیٹی اونہہ۔ جاؤ میاں جاؤ اپنا مقام پہچانو اور پھر شرفا کی طرف بڑھنا۔" ان الفاظ کی برچھیاں تو آج بھی اس کی سماعت کو دلفگار کرتی تھیں۔

بھلانے کو تو بہت کچھ بھلایا جا سکتا ہے مگر اپنی ذات سے نظر چرانے کے لیے بڑا دل چاہیے، اور وہ تو شاید یہ سب کچھ کرنے کی کوشش بھی کر ڈالتا، مگر ہر بار کوئی نہ کوئی اس کے زخموں کو چھیڑ دیتا تھا۔ نئے سرے سے درد جگا دیتا تھا۔

اگر وہ جانتا کہ ماموں جان اس کے لیے چھوٹے ماموں کے یہاں پرپوزل لے کر جا رہے ہیں تو وہ بہت پہلے ہی انہیں روک دیتا۔ اپنی کم حیثیتی کا ادراک ہی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا کہ اس پر مستزاد بار بار کی یاد دہانی اسے مزید منتشر کر کے رکھ دیتی تھی، اس کے احساس کو اور بھی بکھیر دیتی تھی۔

؎ کون پرایا درد سمیٹے کون مسیحا کہلائے
اپنا درد ہے اپنا پیارے اوروں کو بتلاؤ تو کیا

صبح کا نکلا وہ شام ڈھلے گھر آتا تھا۔ شگفتہ بیگم اور احسان صاحب اس کے رویئے پر سخت پریشان تھے مگر جب اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ یوں ظاہر کرتا جیسے اس کے اندر کوئی جوار بھاٹا ہی نہیں اٹھ رہا۔ بلکہ اپنے ہر انداز سے وہ یہی جتاتا جیسے کہ وہ اپنی زندگی انجوائے کر رہا ہے۔ نہایت پُرسکون نظر آتا۔

اس شام بھی ڈیک پر وہ دھیمی دھیمی غزلیں سُن رہا تھا۔ ابن انشا کی شاعری یوں بھی اس کی فیورٹ تھی دل کے درد کی آواز بن جاتی تھی شاید اس لیے۔

؎ ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں کی
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں کی
اچھا بھلی بنتے ہوئے مٹتے ہوئے دیکھو
ہم موج گریزاں ہی سہی آب رواں کی

برابر والے کمرے سے اسریٰ اور حمزہ کا شور مستقل اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ ذہن اُلجھا ہوا ہو تو ہوائیں بھی شور مچاتی لگتی ہیں۔ جبکہ اس وقت تو باقاعدہ لڑائی جھگڑے کے ساتھ شور مچایا جا رہا تھا، جس میں ڈیک کی آواز بھی دب رہی تھی۔

"ہیٹر۔ ہیٹر۔" اسریٰ کی آواز اسے سخت مشتعل کر گئی۔

"یہ کیا شور مچایا ہوا ہے۔" دھڑ سے دروازہ کھول کر وہ دھاڑا تو لمحے بھر کے لیے ہر چیز ساکت ہوگئی۔ کمرے میں مناہل بھی موجود تھی۔

اسریٰ اور حمزہ یکدم سہم کر مناہل کے پیچھے چھپ گئے، خود مناہل بھی وحشت زدہ سی بیٹھی ہوئی دزدیدہ نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"اوہ۔ آپ یہاں موجود ہیں اور یہ ہنگامہ برپا ہو رہا ہے۔" وہ سخت تیور لیے مناہل سے مخاطب تھا۔ وہ محض لب کاٹ کر رہ گئی۔

"پڑھانے کا یہ کون سا انداز ہے، دو منٹ سکون سے آنکھیں بند کرنا عذاب ہوگیا میرا۔ اور تم دونوں! کیا آفت آئی ہوئی ہے تم پر۔"

اسے سخت سُست سنا کر ان دونوں کو گھورا جو مناہل کے پیچھے سے جھانک رہے تھے، اس کے سوال پر دوبارہ پیچھے چھپ گئے۔

"اب ایک آواز نہ آئے مجھے، سمجھے۔" انہیں وارننگ دیتا وہ غصے سے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے ایک تنبیہی نظر ہراساں کھڑی مناہل پر بھی ڈالی، جواب تک بر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے تھی۔ دروازہ اسی رفتار سے بند کر ڈالا۔

جس روز سے صہیب نے زہرہ بیگم کی باتیں سنی ہیں۔ تب سے وہ اتنا منتشر ہوگیا ہے۔ نہ ہنستا ہے نہ بولتا ہے، نہ ہی وقت پر کھانا کھاتا ہے۔ رات کو اکثر لان میں ٹہلتا رہتا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں احسان حقیقتوں کو جان کا روگ نہ بنائے، بلکہ انہیں قبول کرنے کی کوشش کرے۔" شگفتہ بیگم اس کے لیے حد درجے پریشان تھیں۔

"مجھے اندازہ ہے اس بات کا۔ مگر وہ کچھ کہتا ہی نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح اس عفریت سے اس کے ماضی سے نجات دلاؤں۔" احسان صاحب خود بے حد ڈپریسڈ تھے، صہیب سے محبت انہیں سب سے زیادہ تھی اس لیے کہ وہ ان کی بہن کی نشانی تھا اور اس لیے بھی کہ وہ ان سے بہت قریب بھی تھا۔

"ماضی کو چھوڑیے، اس کے مستقبل کا سوچیے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ زمان کے ساتھ ساتھ اس کا بھی گھر بسا دیا جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" شگفتہ بیگم نے اپنے تئیں ایک اچھا خیال پیش کیا۔

"کہاں کریں اس کی شادی، جہاں جائیں گے لوگ اس کا حسب نسب ضرور پوچھیں گے۔" احسان صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تو ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں کہ وہ کس کا بیٹا ہے۔" محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے، اس وقت شگفتہ بیگم بھی اس کی محبت میں سارے حقائق بھلائے دے رہی تھیں،

"مگر یہ اسے قبول نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب۔ کیا صہیب نے کچھ کہا آپ سے۔" وہ ٹھٹک گئیں۔

"ہوں۔ وہ پشاور میں ہانی کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے میری اور تمہاری اجازت چاہیے اسے۔ وہ اس شہر سے جس میں اس کا ماضی اب تک زندہ ہے چلے جانا چاہتا ہے۔ کل ہی بات کی ہے اس نے مجھ سے۔" بالآخر انہوں نے اپنی رفیقِ حیات کو یہ روح فرسا خبر

بھی سُنادی۔

"مگر کیوں۔ آپ نے پوچھا نہیں اس سے" شگفتہ بیگم تڑپ سی گئیں۔

"ہاں مگر اس نے یہی کہہ کر ٹال دیا کہ وہ ہارون کے ساتھ مل کر بزنس کرنا چاہتا ہے۔" احسان صاحب کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔ محبت اور شفقت میں انہوں نے اسے کوئی کمی نہ ہونے دی تھی، مگر سوسائٹی میں اسے مقام دلانا ان کے بس سے باہر تھا۔

بہت عرصہ پہلے جب ان کے کسی جاننے والے نے پہلی بار اسے اس کے باپ کے نام کا طعنہ دیا تھا جب ہی احسان صاحب نے اس سے کہا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے باپ کا نام بتانا چھوڑ دے، مگر وہ اس پر راضی نہیں تھا اسے بھی ضد ہو گئی تھی کہ وہ اس نام کے ساتھ اپنا مقام بنائے گا، مگر شاید ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ جب ہی اسے ہر قدم پر ٹھوکر لگ رہی تھی۔

"مگر—"

"پلیز شگفتہ بیگم اسے روکنا نادان دوستی ہوگی اس کے ساتھ" اور ہم یہ رسک نہیں لے سکتے، اگر اسے ذہنی اُلجھنوں سے نجات دلانی ہے تو اُسے خود سے اس شہر سے جہاں اس کے باپ کے نام کا داغ اسے شرمندہ کرتا رہتا ہے، دور رکھنا ہی ہوگا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ بالآخر سُنا ڈالا۔

ماموں جان نے سب گھر والوں کو کس طرح راضی کیا اسے معلوم نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے ساتھ ہی یہ کڑی شرط بھی عائد کر ڈالی کہ وہ ان کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا، اسی صورت میں اسے جانے کی اجازت ملی تھی۔

"مگر ماموں جان—"

"نہیں بیٹے بحث کی گنجائش نہیں۔ اگر تم ہم سے کچھ منوانے کا حق رکھتے ہو تو اتنا استحقاق تو ہمارا بھی ہے کہ تمہیں حکم دے سکیں۔" نرمی سے کہتے ہوئے انہوں نے اسے آزاد کرتے ہوئے بھی پابند کر ڈالا۔

بیگم میمونہ کے نام جتنی پراپرٹی تھی اس کا بیشتر حصہ نورمحمد حسن کے گھناؤنے کاروبار کی نذر ہو گیا تھا مگر کافی کچھ احسان اور فیضان صاحب نے عقلمندی سے بچا بھی لیا تھا۔ جو آج صہیب کے کام آرہا تھا۔ لہٰذا اس کے حصے کا جتنا بھی سرمایہ بنتا تھا اور کچھ اپنی محبت کا فرض سمجھ کر جو کچھ ان سے ہو سکا انہوں نے اسے سونپ دیا۔

؎ میں ریت ہوں کسی طوفان کی زد پہ آیا ہوں
میرا وجود بڑی دور تک بکھرنا ہے!!

شہر پشاور اس کے لیے قطعی انجان تھا۔ وہ سیدھا ہارون کے گھر ہی پہنچا، چونکہ اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ لہٰذا ہارون حیران رہ گیا۔

"صہیب تم!" ہارون حسبِ توقع بلکہ توقع سے بھی بڑھ کر گرمجوشی سے ملا۔ کھینچ کر گلے لگالیا۔ "کیسے میرے غریب خانے کو رونق بخشی۔"

"بس اب یہی غریب خانہ میری آخری امید ہے ہانی۔" اپنا مختصر سا سامان اس نے ایک طرف رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کیا مطلب ہے؟" وہ متعجب رہ گیا۔

"مطلب یہ کہ نصیب در بہ در تیرے آزمانے آیا ہوں یعنی کراچی کو خیرباد کہہ دیا ہے میں نے۔" بظاہر بےفکری سے شانے اُچکا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے بتایا۔

"آر یو سیریس صہیب؟" ہارون کی خوشی دیدنی تھی۔

"ہاں۔" گہری سانس بھر کر اس نے پیروں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرایا۔

"اوہ۔ پھر تو مٹھائی منگوانی چاہیے۔" ہانی مسرور سا باہر نکل گیا۔

جب سے سفر کے لیے نکلا تھا اب کہیں جا کر ذہن کو سکون نصیب ہوا۔ ذرا دیر میں ہی ہارون ناشتے کے نام پر اتنا کچھ لے آیا کہ وہ بوکھلا گیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے فکرمندی سے بھری ہوئی ٹرالی پر نظر ڈالی۔

"ناشتا ہے میری جان! آپ اس وقت پشاور میں موجود ہیں، اور یہاں اسی قسم کا ناشتا ہوتا ہے۔" ہارون اس کے خوفزدہ انداز پر ہنس پڑا۔

"تم لوگ کیا تینوں وقت کا کھانا ایک ہی وقت کھا لیتے ہو۔" وہ بمشکل مسکرایا۔

"بکو مت اور بسم اللہ کرو بلکہ اٹھو پہلے ذرا ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔" اس نے زبردستی اسے واش روم

میں دھکیل دیا۔

ناشتے کے بعد ہارون نے اُسے آرام کرنے کی خاطر اپنے کمرے میں چھوڑا اور خود باہر نکل گیا۔ ذرا فرصت ملی تو اُس کی سوچوں کا رُخ گھر کی جانب مڑ گیا۔

"جانے میں نے گھر چھوڑ کر اچھا ۔۔۔ کیا کہ نہیں مگر وہ گھر بھی کون سا میرا تھا۔ لیکن میری ماں کا تو تھا اور میں نے بھی تو ساری زندگی وہیں گزاری تھی۔" اس کے اندر سوال و جواب کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا تھا۔ ہارون اندر آیا تو اس کی بند آنکھوں والے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر سمجھ گیا کہ معاملہ وہ نہیں، جو وہ سمجھ رہا ہے بلکہ بات کچھ اور ہے اور یہی اسے پتا کرنا تھا۔

وہ گھر سے جو کچھ سوچ کر نکلا تھا وہ سب ہارون سے بیان کر دیا۔

"آئی ایم سوری صہیب! میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے ساتھ یہ مسئلہ تھا۔ بہرحال زندگی ماضی کے ساتھ سفر نہیں کرتی بلکہ مستقبل کے سنگ چلتی ہے، جو ہو گیا اسے بھلایا تو نہیں جا سکتا، مگر اسے زخم بنا کر پالنے کی بھی ضرورت نہیں۔ دنیا بہت بڑی ہے، تم یہاں آئے ہو تو انشاء اللہ مایوس نہیں ہو گے۔" ہانی کی محبت پر تو اسے اندھا اعتماد تھا۔

اور واقعی ہارون نے اپنی لازوال محبت کا ثبوت بھی دیا۔ اس کے گھر والے بھی اُس کی طرح مہمان نواز اور دوست نواز قسم کے تھے۔

بڑے لالہ اور بابا جی کو دیکھ کر اسے ماموں جان اور زمان بھائی یاد آ گئے۔ وہی شفقت اور وہی زندگی سے محبت کرنے پر مجبور کر دینے والا انداز تھا۔

پیسہ اس کی کمزوری نہیں، اس کا مشغلہ تھا، سو اس کے لیے دن رات ایک کرنے کا بھی احساس نہ ہوتا۔ مقامی مصنوعات بین الاقوامی مارکیٹ میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، سو اس نے بابا جان اور لالہ کے مشورے سے ہارون کے ساتھ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دیا۔ گو کہ دونوں ہی ناتجربہ کار تھے، مگر بابا جان نے ان کا بہت خیال رکھا اور چند مہینوں میں ہی وہ دونوں خاصے پُراعتماد ہو گئے۔

ان چند ماہ میں اس نے دو بار کراچی کا چکر بھی لگایا۔ خط اور فون کا سلسلہ بھی بلاتوقف جاری تھا اس کے باوجود وہاں جیسے ہر دم اس کی فکر ہی لگی رہتی تھی سب کو۔

زمان بھائی کی شادی تھی، لہٰذا سب کا اصرار تھا کہ اُسے سب سے پہلے موجود ہونا چاہیے، خود اس کا دل بھی وہاں جانے کو چاہ رہا تھا۔ سو سب کچھ ہارون پر چھوڑ کر آ گیا۔

چھوٹی ممانی زہرہ بیگم اس سے کافی کھنچی کھنچی سی تھیں، فیضان ماموں نے بھی محض دعا سلام ہی کی، جانے وہ اپنے کیے پر نادم تھے کہ خوش، البتہ اس نے بھی ان کی باتوں کو دل سے نہیں لگایا کہ بہرحال زندگی میں انسان کو اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔

گھر میں خوشیاں راج کر رہی تھیں، جو کہ اُس کے آنے سے اور بھی بڑھ گئیں۔ اسریٰ اور حمزہ کی معیت میں دن بہت اچھے گزر رہے تھے، کیونکہ بھابی کو تو شاپنگ سے ہی فرصت نہیں تھی۔ البتہ بشریٰ باجی کی ناراضگی اپنی جگہ قائم تھی۔ اسے دیکھا تو فوراً خفگی کے اظہار کے طور پر رُخ موڑ لیا۔

"ارے ارے باجی! آپ اب تک روٹھی ہوئی ہیں۔" اس نے ہنس کر ان کا رُخ اپنی جانب کیا۔

"تو تجھے کیا ضرورت پڑتی ہے۔" وہ جھٹ انجان بن گئیں۔ گویا کہ یہ بھی ناراضگی ظاہر کرنے کا طریقہ تھا۔

"پلیز یار۔ آپ تو کم از کم مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ سنجیدگی سے شکوہ کناں ہوا۔ بشریٰ اُلجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"دیکھو صہیب! سارے لوگ دنیا میں ایک جیسے نہیں ہوتے، یہ تو ان لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ تمہیں انہوں نے ٹھکرا دیا۔ وہ تمہاری اہمیت سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ ہیرے کی قدر تو صرف جوہری جانتا ہے۔ میں جانتی ہوں ہم سب کو معلوم ہے کہ تم کیا ہو۔ اسی لیے ہم نے تمہارے لیے دوسری لڑکی دیکھ لی ہے۔" گویا کہ ڈھاک کے وہی تین پات تھے۔

"باجی پلیز۔" وہ بات کاٹ کر بول پڑا۔

"پلیز صہیب! میری بات مکمل ہونے دو۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ "ایک بار ٹھوکر لگ جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان راستہ بدل دے۔ یہ تو کم ہمتی ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ آج زمان کے ساتھ تمہاری شادی بھی ہو رہی ہوتی تو ہمیں کتنی خوشی ہوتی۔

ان کی بات وہ لب بھینچے بڑے ضبط سے سن رہا تھا۔

"بابا اور امی تمہارے سگے والدین نہیں، مگر انہوں نے تمہیں ہم سب کی طرح بڑی محبت سے پالا ہے تو کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ تمہاری راہ میں پھول بچھا کر تمہاری خوشیوں کو محسوس کر سکیں۔" بشریٰ آج اس کے ہاتھ تنگ جانے پر سارے حساب بے باق کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ وہ لاجواب سا ہو گیا۔

"میں نے ایسا تو نہیں کہا بشریٰ باجی!" لہجہ خود بخود دھیما پڑ گیا۔

"تو پھر تمہارے انکار کا کیا جواز ہے؟ کیا تمہیں ہماری پسند اور انتخاب پر اعتماد نہیں؟" ان کا سوال کڑا تھا وہ پشیمان ہو گیا۔

"آئی ایم سوری یہ بات نہیں۔ مگر اب اس بارے میں سوچنے کا دل نہیں چاہتا۔ میں ایک بار نہیں دو بار یہ ذلت سہہ چکا ہوں۔ ایک بار غیروں کے ہاتھوں، اور ایک بار اپنوں کے۔" بات کہہ کر وہ طنز سے ہنس پڑا۔ بشریٰ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ کتنے ہی سوال ان کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ نبیلہ وقار کبھی میری سانسوں کی ڈور سے بندھی ہوا کرتی تھی۔ اور اسی کے طفیل مجھے اپنی "حیثیت" پہچاننے کا موقع ملا تھا۔"

اس کی ——— آنکھوں میں یکدم اضطراب سرخ ڈوروں کی صورت اتر آیا۔ لفظ "حیثیت" اتنے تیکھے انداز میں ادا کیا کہ بشریٰ بھی سر جھکا گئیں کہ بہرحال اس کمپلیکس سے اسے باہر لانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"مگر صرف ایک بار ہم پر یقین کر کے دیکھو صہیب! یقین کرو تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔ اگر اس مرتبہ بھی ناکامی ہوئی تو پھر۔ تم وہی کرنا جو تمہارا دل چاہے۔ لیکن ابھی انکار مت کرو، ہمیں بات تو کرنے دو۔" وہ بڑی محبت سے کہہ رہی تھیں۔

"اچھا بابا! جو آپ کا دل چاہے کریں، مگر فی الحال تو زمان بھائی کا معاملہ ہے پہلے اسے نبٹا لیں، پھر میرے متعلق بھی سوچ لیجیے گا۔" وہ تھک کر ہتھیار ڈالتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تو گویا بشریٰ کی مراد بر آئی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو صہیب، یقین کرو تم نے میرا مان بڑھا دیا۔" ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ان کے مسرور انداز پر مسکرا دیا۔

دوسرے دن اچھی خاصی مصروفیت رہی، وہ ماموں جان اور بڑے بھیا کے ساتھ ساتھ کام میں لگا ہوا تھا۔ شام کو جب سب دلہن کے ہاں پہنچے تو ہر طرف گہما گہمی اور رونق لگی ہوئی تھی۔ گانوں اور رسموں کے لامتناہی سلسلے کے بعد بمشکل کھانا شروع ہوا۔

آج عنیزہ اپنی بہن کی خوشی میں کچھ زیادہ ہی چہک رہی تھی، جانے اسے ہی محسوس ہوا یا پھر حقیقت بھی یہی تھی، کہ وہ آج خود کو بہت اونچی شے سمجھ رہی تھی، اس کی نظروں میں اپنے لیے تمسخر اور تحقیر محسوس کر کے وہ بری طرح کھول گیا۔ اس خاموش تذلیل پہ چہرا سرخ پڑ گیا اس کا تب ہی گھر جانے کا قصد کر ڈالا۔

"بشریٰ باجی۔ مجھے گھر جانا ہے، میرا سر درد کر رہا ہے آپ مامی جی کو بتا دیجیے گا۔" اتنے سارے لوگوں میں گھری بشریٰ باجی کو بہت مشکل سے الگ لے جا کر اس نے کہا۔

"مگر ابھی تو۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں یار! پلیز مجھے روکیے مت۔ یوں بھی کل کتنے ہی سارے کام مجھے کرنے ہیں۔" بے زاری اس کے چہرے سے مترشح تھی بشریٰ لمحے بھر میں ساری بات سمجھ گئیں۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر جاؤ گے کیسے۔ بائیک پر مت جانا یوں کرو کہ ساجد کی گاڑی لے لو، اور مناہل کو بھی اس کے گھر ڈراپ کر دینا۔ شاباش اب جاؤ۔" انہوں نے منٹوں میں ہی اسے بولنے کا موقع دیے بغیر فیصلہ سنایا اور فوراً دوسری طرف مڑ گئیں۔ وہ کچھ کہنے کا سوچتا ہی رہ گیا۔

ذرا دیر بعد کی چین اور مناہل سمیت وہ اس کے پاس چلی آئیں۔ کی چین تھما کر اسے سلو ڈرائیونگ کی تاکید کرتی وہ ان دونوں کو چھوڑنے باہر تک آئیں۔ اندر کھانے کے بعد سب لان میں جمع ہو گئے تھے۔ غزلوں کا پروگرام تھا۔

"او کے مناہل۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی اور صہیب تم اب جا کر سو جانا، بلاوجہ کی باتیں ذہن پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔" مناہل سے کہہ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

اس نے گہری سانس بھر کر کار اسٹارٹ کر دی۔ ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی مناہل بہت رات گزرنے کے باعث کافی پریشان بیٹھی تھی، جبکہ خود وہ عنیزہ کے تحقیر آمیز

روتے کو سوچ کر لب بھینچے بہت خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ مناہل کا گھر آیا تو اُس نے کار روک دی۔

"شکریہ۔" وہ بہ عجلت دروازہ کھول کر یوں نکل جیسے صدیوں بعد زنداں سے رہائی نصیب ہوئی ہو۔ اس نے سوچا گاڑی آگے بڑھالے جائے مگر رات کا وقت اور اکیلی لڑکی کا خیال کرتے ہوئے رُک گیا۔ مناہل دروازے پر کھڑی بیل پر بیل بجا رہی تھی مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی نہ کوئی آرہا تھا نہ ہی دروازہ کھل رہا تھا۔

"پاپا" اس کا دل انجانے خدشوں سے سہم گیا۔ بے تحاشا گیٹ پیٹتے ہوئے وہ بے قراری سے پکارنے لگی۔

"خدا خیر کرے۔" وہ بھی گھبرا کر باہر نکل آیا۔

"پاپا پلیز، دروازہ کھولیں۔" مناہل بُری طرح رو رہی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر حالات کی سنگینی کی طرف متوجہ رہا۔

"محترمہ! برائے کرم آپ رونا بند کریں میں اندر جاکر دیکھتا ہوں۔" اس سے نرم لہجے میں کہہ کر وہ دیوار پھاند گیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ شکر تھا کہ گیٹ کی صرف کنڈی لگی تھی تالا غائب تھا۔ گیٹ کھلتے ہی وہ تڑپ کر اندر کی جانب "پاپا پاپا" کہتے بڑھ گئی۔ وہ متذبذب سا باہر ہی رُک گیا۔ امید تھی کہ وہ باہر آکر اسے "سب خیر ہے" کی اطلاع دے دے گی تو وہ بھی چلا جائے گا مگر دوسرے ہی لمحے اسے دل دوز نسوانی چیخ سنائی دی وہ لپک کر آواز کے تعاقب میں اندر بڑھا۔ دوسرے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر شخص بڑے بے ترتیب انداز میں بستر پر پڑا تھا۔ مناہل اسے ہلا ہلا کر پکار رہی تھی مگر جواب ندارد تھا۔

"ہاسپٹل لے جانا پڑے گا۔" اس نے نبض دیکھتے ہی کہا اور جلد ہی انہیں اُٹھا کر گاڑی میں لا کر لٹایا۔ مناہل ہچکیوں سے روتے جا رہی تھی، وہ مزید پریشان ہو گیا۔

"دیکھیے محترمہ! آپ کے رونے سے خواہ مخواہ ٹینشن بڑھ رہی ہے برائے مہربانی خود کو سنبھالیں۔ گھر لاک کریں اگر۔ ہاسپٹل جانا ہے۔" اس نے قدرے سختی سے کہا تو وہ آنچل سے آنسو صاف کرتی گھر لاک کرکے پلٹ آئی۔ رستے بھر اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔

ایمرجنسی میں اس کے والد کو آئی۔ سی۔ یو لے جایا گیا۔ ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔۔۔ وہ مناہل کو اکیلا چھوڑ کر گھر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ دو تین گھنٹے سخت پریشانی میں گزرے وہ کاریڈور میں ٹہل ٹہل کر تھک رہا تھا جبکہ مناہل آنسو بہاتی جانے کون کون سی دُعاؤں کا ورد کیے جا رہی تھی، گھر پر فون کیا تو معلوم ہوا کہ ماموں جان وغیرہ واپس آگئے تھے، اس نے انہیں اطلاع دی۔ ذرا دیر میں وہ بھی پہنچنے والے تھے۔

"آپ پریشان نہ ہوں مامی جی آرہی ہیں۔" وہ اس کے پاس آکر حلاوت سے بولا۔ کاجل سے بھری آنکھیں اظہارِ تشکر سے بھیگ گئیں۔ آج وہ اس کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

بلیک ایمبرائیڈری والے لیمن کلر سوٹ میں وہ متورم چہرہ لیے بہت دلکش لگ رہی تھی، کالے سیاہ بالوں کی لٹیں دوپٹے کے ہالے سے باہر نکل آئی تھیں۔ اطالوی نقوش مدہم روشنی میں بھی بہت واضح تھے۔ اس نے نظر پھیر لی۔

"مناہل۔" کاریڈور کے آخری سرے پر اسے شگفتہ بیگم متفکر سی نظر آئیں۔ مناہل دوڑ کر ان کے بازوؤں میں سمٹ کر پھوٹ۔۔۔ کر رو دی۔ ماموں جان اسے تسلی دے کر۔ اس کے پاس چلے آئے۔

"کیا ہوا ہے؟" تشویش سے اُنہوں نے پوچھا تو اس نے ڈاکٹر کی تشخیص بتا ڈالی۔

"اوہ نو۔ عمر کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہے تھے، اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ "تم شاید اسے پہچانتے نہیں، وہ میرا بچپن کا دوست عمر آفتاب ہے۔"

"ریئلی۔" وہ واقعی متعجب ہوا۔ "اوہ جبھی سب گھر والوں کا سلوک اس سے دوسرے پڑوسیوں کی نسبت اتنا مختلف تھا۔" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"تم گھر جانا چاہو گے۔" ماموں جان نے اسے پکارا تو وہ بلا ارادہ ہی سر ہلا گیا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ ہم یہاں ہیں۔" اُنہوں نے اسے اجازت دے دی تو وہ سیدھا گھر واپس آگیا۔

گزشتہ تین گھنٹوں کی ٹینشن اور ذہنی انتشار نے اسے بُری طرح تھکا ڈالا تھا۔ گھر پہنچ کر سب کے سوالوں

کا مفصل جواب دے کر جب وہ کمرے میں آیا تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ لہٰذا بستر پر لیٹتے ہی وہ سو گیا۔ البتہ سوتے سوتے عنیزہ اور چھوٹی مامی کا رویہ اسے ڈسٹرب کرتا رہا۔ دل میں ٹیس جگاتا رہا۔

دوسرا دن مہندی کے فنکشن کی نذر ہو گیا۔ آج بھی مخصوص لوگوں کا تضحیک آمیز رویہ اسے اندرونی خلفشار میں مبتلا کر رہا تھا۔ مگر چاہنے کے باوجود وہ گھر چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ مگر جلد ہی قسمت کو رحم آ گیا اس پر اور بڑے بھیا نے اسے ہاسپٹل بھیج کر ماموں جان کو بلوا لیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں وہ پہلی فرصت میں ہاسپٹل پہنچا اور ماموں جان کو بھیج کر وہیں ویٹنگ روم میں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

مناہل کے والد کی حالت اب بھی خطرے سے باہر نہیں تھی۔ ماموں جان کی زبانی اسے پتا چلا کہ وہ عرصہ ہوا اپنے والدین کو چھوڑ کر اٹلی جا بسے تھے، اور وہیں شادی بھی کی اور جلد ہی اس شادی کا منطقی انجام بھی سامنے آ گیا۔ ان کی اطالوی بیوی ان سے نباہ نہ کر سکی۔ تو وہ مناہل کو لے کر وطن واپس آ گئے، مگر یہاں والد کے انتقال کے بعد سوتیلی ماں نے انہیں دوبارہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ جس کے باعث آج اس کسمپرسی میں ان کی بیٹی کے سر پر دست شفقت رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے مناہل سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی، بھری دنیا میں اکیلے ہونے کا احساس کتنا اذیت رساں ہے یہ صرف وہ ہی جانتا ہے جو بھرے میلے میں تنہائی جھیلتا ہے۔

شادی والے روز ہارون حسب وعدہ آیا تو وہ سب کچھ بھول کر اس کے ساتھ لگ گیا۔ ماموں جان نے زبردستی مناہل کو بھی بلوا لیا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف مضمحل اور پریشان چہرہ لیے بیٹھی رہی اور جلد ہی اٹھ کر ہاسپٹل چلی گئی۔ بحیثیت مجموعی سارے فنکشن اچھے رہے، ولیمے کے بعد وہ ایک دن بھی ضائع کیے بغیر ہارون کے ساتھ لوٹ آیا۔ منزہ کے آنے کے بعد سے عنیزہ اور زاہرہ بیگم یعنی چھوٹی مامی کی آمد و رفت بڑھ گئی تو اس کے لیے مزید رکنا محال ہو گیا۔ ناقابل برداشت لوگوں کا سامنا کرنے کو اس کا دل قطعی نہ چاہتا تھا۔ یوں بھی ولیمے والے روز اسے عنیزہ کے متوقع منگیتر کا تعارف بھی حاصل ہو گیا تھا۔ جس کے بعد سے عنیزہ اور چھوٹی مامی کے مغرورانہ انداز کو اور بھی عروج حاصل ہوا۔

ہارون اور تمام گھر والے اسے سمجھاتے رہے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ مجھے اپنا بزنس دیکھنا ہے یہاں پر جو کام تھا وہ تو کر لیا۔ لہٰذا اب رکنے کا کوئی جواز نہیں۔ ہارون نے کہا بھی کہ میں دیکھ لوں گا مگر اس کی ہٹ دھرمی کے باعث چپ رہا کہ بہرحال یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔

پھر چاک زندگی کو رفوگر ملا کہاں
جو زخم ایک بار کھلا پھر سلا کہاں

پشاور پہنچ کر وہ یوں مصروفیت کا قصداً شکار ہوا کہ ہارون سے ڈھنگ سے بات کرنے کا وقت نہیں ملتا۔

چند دن بعد ہی جس جس نے اسے دھچکا پہنچایا وہ مناہل کے والد کے انتقال کی خبر تھی۔ اسے خاصا افسوس ہوا۔ اکیلے پن کا شکار وہ لڑکی مزید تنہا رہ گئی تھی۔ ماموں جان نے فون پر اسے بتایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بہت رنجیدہ تھے شاید ان کی ہاں بہت قربت تھی۔ عمر آفتاب صاحب سے، بہرحال اس نے اپنی جانب سے تعزیت کر لی تھی۔

دن بہت تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے، زمان بھائی کی شادی کو تین مہینے گزر چکے تھے، اور اس دوران اس نے صرف خطوط اور فون پر انحصار کیا۔ وہاں جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔ ماموں جان اور مامی نے گو کہ ہر بار سخت تاکید کی مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو اسے خاک چھاننے پر اکساتا رہتا تھا۔ ان دنوں وہ اس قسم کے ڈپریشن کا شکار تھا کہ ماموں جان اور بڑے بھیا بغیر اطلاع کیے ہی آ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ماموں جان اسے بہت پرجوش نظر آ رہے تھے۔ یہی حال بھیا کا بھی تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ سکا البتہ ان کی خاطر میں لگ گیا۔ چائے اور لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا جب وہ اندر آیا تو بھیا ہنس پڑے۔

”بھئی صہیب! تم تو کافی سگھڑ ہو گئے ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”چلو اچھا ہے ہماری بہو کو بہت آرام رہے گا۔“

ماموں جان نے بھی شگفتگی کا اظہار کیا تو وہ یکدم لبوں سے غائب ہو جانے والی مسکراہٹ کو بمشکل دوبارہ سجا سکا۔

"گھر پر سب ٹھیک تو ہیں، مامی بھائی بچے وغیرہ۔" موضوع بدلنے کی خاطر اس نے فوراً پوچھا۔

"ہاں، اور سب تمہارے منتظر ہیں، تمہاری مامی کی طبیعت آجکل کچھ ٹھیک نہیں۔" ماموں جان نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چونک گیا۔

"ہم تمہیں لینے آئے ہیں صہیب! امی اپنی طبیعت کی خرابی سے اس قدر دلبرداشتہ ہوگئی ہیں کہ انہوں نے اس ماہ کی پندرہ کو تمہاری شادی طے کر دی ہے۔" بھیا نے ایک اور بم اس کے سر پر دے مارا۔ کتنے آرام اور سکون سے وہ کہہ گئے تھے۔

"کیا؟" وہ یوں چونکا جیسے بے ہوش ہونے کے بعد ہوش میں آیا ہو۔

"تمہارے انکار کا کوئی جواز نہیں اور نہ ہی میں تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔" ماموں جان نے قدرے توقف سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اس پندرہ کو تمہارا اور مناہل کا نکاح ہے مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں بھی یہ تمہاری مامی کی اور میری شدید خواہش ہے۔ تم سرتابی کا حوصلہ رکھو بھی تو میں تمہیں اس جرأت کی اجازت نہیں دوں گا۔" احسان صاحب پیش بندی کے طور پر کہہ رہے تھے۔

اس نے متفکر ہو کر بھیا کی طرف دیکھا جن کی حمایت کا ووٹ ماموں جان کے ساتھ تھا۔ اس سے پوچھے بغیر سب کچھ طے کر لیا گیا تھا۔ سارے الفاظ جیسے گم ہو گئے تھے وہ خواہش کے باوجود چپ بیٹھا رہ گیا۔

"تمہارا اعتراض یہی تھا نا کہ تمہیں تمہاری ذات کی خوبیوں سمیت قبول کیا جائے تو یقین کرو مناہل نے ایسا ہی کیا ہے، ویسے بھی وہ بہت تنہا ہے اسے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، صہیب!" بھیا نے دھیرے سے اس کا شانہ ہلایا تو وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ذہن ان کے آخری فقرے پر اٹک گیا۔

"تنہا ہے اور سہارا چاہیے۔" الفاظ بازگشت بن کر اس کے اندر چکرانے لگے۔

"مائی گاڈ۔" جھک کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "تو صہیب حسن یہ طے ہو گیا کہ محبت تمہارے نصیب کا ستارہ نہیں۔ مجبوری کے سودے میں پیار کا بھاؤ سب سے کم ہوتا ہے۔ تم اور مناہل "اندھے اور لنگڑے" کی کہانی کے کردار ہو جنہیں زندگی کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے محض تنکے کا سہارا ہے۔"

وہ شکست وریخت کے عظیم سانحے سے دوبارہ دوچار تھا۔ ماموں جان نے اس کے سپاٹ چہرے پر خوشی کی کرن تلاش کرنی چاہیے اور ناکام ہو کر استفہامی نظریں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

"کیا تمہیں ہمارا فیصلہ قبول نہیں صہیب۔" عجیب سپاٹ اور لیا دیا انداز تھا ان کا جو اس کے دل میں ترازو ہو گیا۔

"نہیں ماموں جان ایسی بات نہیں۔ آپ کی محبتوں کا بہت قرض ہے مجھ پر اور مجھے آپ کا ہر فیصلہ دل سے قبول ہے۔" بدقت تمام اس نے خود کو بولنے کے قابل کیا۔

"جب اذیت سہنی ہی ہے تو پھر ان کے لیے کیوں نہ سہی جائے، جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔" فیصلہ کرنا آسان ہو گیا تھا۔

ماموں جان نے آگے بڑھ کر فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

"خوش رہو میری جان۔ تم نے مجھے عمر کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔" ماموں جان کی خوشی اس کے دل پر پڑے بوجھ کو بہت حد تک ہلکا کر گئی۔

"اگر زندگی یوں بھی گزر جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔" اس نے سینے میں بھڑکتے الاؤ پر ٹھنڈی چھینٹیں پڑتی محسوس کیں اور خود کو سمجھانے پر کمربستہ ہو گیا۔

لانا تھا اس کے واسطے خود کو بھی راہ پر
ہم سے یہ اہتمام بڑی دیر سے ہوا!

ماموں جان اور بھیا کے جانے کے دو دن بعد ہی ہارون بھی لوٹ آیا۔ یہ نئی خبر اتنی مسرت انگیز تھی کہ وہ باقاعدہ اس سے لپٹ گیا۔

"دیکھا تو نے میری منگنی کس قدر بھاگوان رہی۔" ہارون نے نیا نکتہ اٹھایا تھا۔

"پڑھ لکھ کر بھی ابھی تک تمہاری عقل وہیں کی وہیں ہے۔" وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا بکواس نہیں چلے گی، مٹھائی بلکہ ٹریٹ کا فٹافٹ انتظام کرو۔"

"وہ تو تمہیں پندرہ تاریخ کو مل جائے گی۔" شوخی سے بولا۔

"واٹ۔ شرم کرو کنجوسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

ہارون تلملا گیا۔ وہ یونہی مسکراتا رہا۔ یہ شاید اس کی مسکراہٹ ہی تھی جس نے ہارون کو مطمئن کر دیا۔ یوں بھی اسے دل کا حال سنانے سے کیا فائدہ تھا۔

شام و سحر جیسے کسی طلسم کے زیر اثر گزر رہے تھے۔ بھابی اور بشریٰ باجی کے کوئی دس فون آچکے تھے وہ اسے فوراً بلا رہی تھیں جبکہ وہ تیرہ سے پہلے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہارون نے اس کے اکاؤنٹ ——— سے بہت بڑی رقم نکلوا دی تھی۔ پیسوں کا اسے نہ تو شوق تھا نہ ضرورت، لہٰذا اس کا اپنا اکاؤنٹ ہمیشہ بھرا رہتا تھا ماموں جان کو ہر ماہ آدھی کمائی بھیجنے کے باوجود بقول ہانی وہ خاصا امیر تھا۔

"یہ سب کیوں۔" وہ استعجاب سے ہارون کو دیکھنے لگا۔

"احمق آدمی! کیا اب بھی ماموں جان خرچا کریں گے تمہاری شادی پر۔ تمہارا کاروبار اسٹیبلش ہو چکا ہے۔ اپنی خوشی ایسی مناؤ کہ جلنے والے تاعمر پچھتاوؤں کی آگ میں سلگتے رہیں۔" ہارون نے کچھ اس تیکھے لہجے میں کہا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

زمان بھائی کا دھمکی بھرا فون آیا تو اسے دس تاریخ کو ہی فلائنگ کوچ پکڑنی پڑی۔ گھر میں گزشتہ شادیوں سے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا تھا۔ جانے کیوں اس کے اندر کہیں بہت گہرائی میں تاریکی بڑھنے لگی، جب محبتوں اور عنایتوں پہ ہمدردی کا گمان ہونے لگے تو خوشیاں یونہی پھیکی پڑ جاتی ہیں۔

بشریٰ باجی اور بھابی کے ساتھ ساتھ مامی جی بھی حد درجے خوش نظر آرہی تھیں، مسرت کے رنگ بیماری کی کمزوری پر غالب آگئے تھے۔ وہ آیا تو کتنی ہی دیر ان کے پاس بیٹھا رہا۔ سب کو مسرور اور شاداں دیکھ کر وہ اپنے غم بھولنے لگے تھے۔

ہر چیز میں بشریٰ باجی اس کی پسند کو مقدم رکھنے پر تلی ہوئی تھیں۔ جبکہ وہ ان جھنجھٹوں سے جان چھڑا کر ساحل کی طرف نکل جاتا تھا۔ ایک دو بار مناہل سے ملنے کا بھی نے اچھا خاصا انتظام بھی کیا مگر اس کے اندر اتنا انتشار اور خلفشار تھا کہ وہ محض مسکراتا ہوا زمان بھائی کے ساتھ ادھر ادھر ہو جاتا۔ منزہ اپنے گھر والوں کی نسبت کافی شائستہ لڑکی تھی۔ زمان کی صحبت نے بھی اچھا اثر دکھایا تھا۔ وہ بھابی کے ساتھ مل کر اسے خوب چھیڑتی۔ بشریٰ باجی کی عدم موجودگی میں اس کا ویسے ہی خیال رکھتی کہ کبھی کبھی وہ حیران رہ جاتا۔ عنیزہ اور منزہ میں کتنا فرق تھا۔

دونوں مہندی کی رسمیں ایک ہی جگہ ہوئیں کیونکہ مناہل کی طرف سے کوئی رشتے دار تو تھا نہیں، لہٰذا سب ادھر ہی کے لوگ تھے خوب ہلا گلا ہوا۔ اس تمام ہنگامے کی جان منزہ اور بھابی تھیں بشریٰ باجی البتہ مامی جی کے ساتھ بقیہ انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔

صرف چار ماہ کے اندر اندر یہ دوسری شادی تھی گھر میں۔ اسے مناہل کا خیال آیا۔ جانے وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد اتنی جلدی شادی پہ خوش تھی بھی کہ نہیں۔

نہ نہ کرتے بھی بشریٰ باجی نے شادی اور ولیمے کا سوٹ اور تمام زیور اس کی پسند سے لیے، اس کی معلومات اس معاملے میں قطعی کوری تھیں۔ لہٰذا جو انہوں نے آگے رکھا وہ سر ہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ بشریٰ نے بُری طرح جھنجھلا کر اسے کھری کھری سنا ڈالیں۔

"اُفوہ، بھئی مجھے کیا پتا کہ کیا ٹھیک ہے کیا نہیں۔ یہ سب تو آپ کو ان محترمہ سے پوچھنا چاہیے جن کو یہ سب چیزیں استعمال کرنی ہیں۔" وہ بھی جھنجھلا گیا۔

"بیوی کا سنگھار شوہر کی مرضی کا ہو تو وہ زیادہ خوشی محسوس کرتی ہے، تمہاری چوائس مناہل کو زیادہ عزیز ہوگی۔ سمجھے تم۔" انہوں نے اپنا فلسفہ جھاڑا جو کہ اس کے سر سے دو فٹ اوپر ہی رہا۔

نکاح ایک روز پہلے تھا۔ نکاح نامے کا اندراج کرتے ہوئے قاضی صاحب نے مہر کی رقم پوچھی تو فیضان صاحب یعنی چھوٹے ماموں فوراً بولے۔

"پانچ لاکھ لکھیے قاضی صاحب۔ آخر کو بچی کی زندگی کا معاملہ ہے سیکیورٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔" ان کا جملہ تھا کہ آتش گیر بھالا جو سیدھا اس کے سینے میں پیوست ہوا۔

"فیضان! کیا کہہ رہے ہو؟" ماموں جان نے خشمگیں نظروں سے چھوٹے بھائی کو دیکھا مگر وہ اپنی بات کہہ کر مطمئن ہو چکے تھے۔ قاضی صاحب البتہ اب تک جواب کے

انتظار میں تھے۔

"قاضی صاحب! آپ پچاس ہزار مہر لکھیے۔" احسان صاحب نے معاملہ سلجھانا چاہا۔

"نہیں ماموں جان! چھوٹے ماموں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مہر پانچ لاکھ ہی ہوگا۔" اس کا گمبھیر لہجہ اور بھاری آواز کمرے میں اس طور گونجی کہ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"صہیب!" بڑے بھیا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی نظروں میں چھپی خاموش التجا کے آگے ہار گئے۔

نکاح بہت خاموشی سے ہوا، اور مبارک سلامت کا شور اٹھنے پر بھی اس کے اندر خاموشی کی دبیز چادر یونہی تنی رہی۔

بعد میں فیضان صاحب اور احسان صاحب کی آپس میں بہت بحث ہوئی مگر مرغ کی وہی ایک ٹانگ کے مصداق فیضان صاحب اس بات پر اڑے رہے تھے کہ خون ضرور رنگ لاتا ہے' لہٰذا لڑکی کی زندگی کے لیے یہ سب بہت ضروری تھا۔ نکاح میں خواہ مخواہ کی بدمزگی پیدا کرنے کے لیے یہ شوشہ زہرہ بیگم کا چھوڑا ہوا تھا۔ اس بات کا اندازہ اسے رات کو ہوا۔

"اتنا کچھ زیور اور یہ بھاری کپڑے صہیب نے بنائے ہیں۔" وہ ڈائننگ روم سے نکل کر کچن کی طرف جا رہا تھا کہ اندر سے آتی چھوٹی ممانی کی آواز سے پیر وہیں جم گیا۔

"ہاں، بہت مان سے لیا ہے اس نے سب کچھ۔ کتنا اچھا ہے نا سارا سامان۔" منزہ کا سادا انداز میں کہا گیا جملہ زہرہ بیگم کو تپا گیا۔

"اونہہ! خاک اچھا ہے۔ اللہ جانے کیسی کمائی ہے اس کی۔ اب دو دن میں کوئی یوں ساہوکار تو نہیں بن جاتا۔ باپ کی طرح کسی الٹے سیدھے کام میں پڑا ہوگا۔ جبھی مناہل نے چمک دمک سے متاثر ہو کر رشتے کے لیے ہامی بھر لی۔" زہرہ بیگم حسب سابق زہر اگل رہی تھیں۔

"نہیں امی! ایسی بات نہیں۔ زمان بتا رہے تھے کہ صہیب بھائی کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ بہت محنت سے کماتے ہیں وہ۔" منزہ اس کا دفاع کر رہی تھی۔

"کیا امپورٹ کرتا ہے اور کیا ایکسپورٹ کرتا ہے معلوم کیا کبھی تم نے، جو حمایت کرنے بیٹھ گئیں۔"

انہوں نے بیٹی کو بھی لتاڑ کر رکھ دیا۔ اللہ جانے انہیں اس کی ذات سے کیا بیر تھا۔ شاید یہی کہ میمونہ بیگم نے ان کے بھائی کی محبت کو ٹھکرا کر رومی حسن کا ہاتھ تھاما تھا۔

"پلیز امی! ایسے مت کہیں صہیب بھائی تو بہت ہی نائس ہیں۔ رہ گئی مناہل تو اسے تو زندگی گزارنے کے لیے سہارا چاہیے۔" وہ بڑی شد و مد سے اس کا دفاع کیے جا رہی تھی۔

"اور اسے بھی سہارا ملا سارا دنیا میں۔ اونہہ۔" زہرہ بیگم نے نخوت سے ناک سکوڑی۔

"مگر وہ جو ______ کہتے ہیں کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے جبھی تو میں نے تمہارے ابو سے کہہ کر مہر پانچ لاکھ لکھوا دیا ہے۔" وہ بڑی رعونت سے کہہ رہی تھیں۔

"پانچ لاکھ۔" منزہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ارے اس لڑکے کا کچھ بھروسا نہیں، بن ماں باپ کی بچی ہے، اس کے مستقبل کے تحفظ کے لیے یہ ضروری تھا۔ آگے اللہ کو جو منظور۔"

"اف میرے خدا۔!" اس نے بمشکل سر تھاما۔ خون کھول اٹھا تھا اس کا، ان رکیک الزامات کو سن کر۔ چہرا مشتعل ہو کر سرخ ہو گیا۔ اس کی زندگی میں کسی خوشی کا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ان سے' وہ غضب ناک ہو کر کچن کے اندر چلا آیا۔

"امی! آپ صہیب بھائی کو بہت غلط سمجھتی ہیں۔ وہ تو۔" منزہ کی بات اسے دیکھ کر ادھوری رہ گئی۔ شرمندگی خجالت اور سراسیمگی کے سارے رنگ لمحے بھر میں اس کی آنکھوں میں آ ٹھہرے ہوتے۔

"رہنے دو منزہ! تمہاری والدہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ انسان اپنی ذات کے آئینے میں ہی دوسرے کا عکس تلاشتا ہے، جو خود اندر سے گھٹیا اور گھناؤنا ہو اسے سب ایسے ہی نظر آتے ہیں۔" مارے طیش کے اس کا لہجہ خوفناک حد تک زہر آلود ہو گیا۔

"لڑکے! زبان سنبھال کے بات کرو۔ گندی نالی کے کیڑے ہو کر ہمیں گالیاں دیتے ہو۔ تم ہو کیا؟ آخر تمہاری اوقات کیا ہے؟" زہرہ بیگم بری طرح بپھر گئیں۔

"میں جو بھی ہوں محترمہ زہرہ بیگم! آپ جیسے اعلا حسب نسب رکھنے والے سے کئی گنا بہتر ہوں۔ جو دوسروں کی ذات میں عیب تلاش کرتے وقت اپنی خامیاں بھول جاتے ہیں۔"

نفرت سے خار خار اس کا لہجہ زہرہ بیگم کو بری طرح

تلملا گیا۔" اور یاد رکھیں آئندہ میں آپ کی گھٹیا زبان سے اپنا نام بھی سننا پسند نہیں کروں گا۔ مائنڈ اٹ۔ یہ میری توہین ہے کہ آپ جیسے لوگ اور صہیب حسن کا نام اپنی زبان پر لائیں۔" وہ غضب ناک لہجے میں کہتا باہر نکل گیا۔ منزہ اور زہرہ بیگم جیسے کسی خواب سے جاگیں۔

"گھٹیا خون کہیں نہ کہیں تو رنگ دکھا ہی دیتا ہے۔ دیکھا تم نے کیا کہہ کر گیا ہے تمہارا صہیب بھائی۔" زہرہ بیگم کا بس نہ چلتا تھا کہ اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں۔

"پلیز امی! ریلیکس ہو جائیں۔ میری خاطر ضبط کر لیں۔ بیوقت گزر جانے دیں آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ زمان، صہیب کے معاملے میں کس قدر حساس ہیں۔ پہلے ہی آپ لوگوں کے باعث مجھے بہت کچھ سننا پڑتا ہے۔" منزہ ملتجی سی ہو کر زہرہ بیگم سے کہہ رہی تھی، جبکہ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ شکست یوں بھی ہو گی، یہ وہ جانتی نہ تھیں۔

اسے اسٹیج پر لا کر بٹھایا گیا تو مناہل پر غیر اختیاری نظر پڑ گئی۔ ہمیشہ سادہ سے روپ اور ہلکے رنگ کے سادہ کپڑے پہننے والی مناہل آج سجے سنورے روپ میں اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ وہ خود حیران رہ گیا۔

ڈارک میرون گولڈن بھاری کام والے شرارہ سوٹ میں طلائی زیوروں سے سجی وہ واقعی نظر لگ جانے کی حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ اطالوی نقوش میک اپ سے اور بھی تیکھے اور حسین ہو گئے تھے خصوصاً اس کی آنکھیں جو بول بھی مقابل کو ہارنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ آج شرم و حیا سے جھک کر مزید دو آتشہ ہو رہی تھیں۔ گجرے اور پرفیوم کی خوشبو میں بسی وہ اس کے پہلو میں بیٹھی اسے زندگی کی سب سے بڑی سچائی لگی۔

بلیک تھری پیس سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح اپنی گرے گرین آنکھوں کی تسخیر کر لینے والی خوبصورتی بہت سراہا گیا۔ ان کی جوڑی کی بہت تعریف کی گئی، جبکہ اس کے اندر دور تک خاموشی کا راج تھا۔ ماموں جان، مامی جی، بشریٰ، زمان، منزہ بھابی اور بڑے بھیا سب آج مناہل کی طرف سے اسے چھیڑ رہے تھے، البتہ ہارون آج بھی اس کا رائٹ ہینڈ بنا سب کے سوالوں کا بڑا برجستہ جواب دینے میں مصروف تھا۔

ذرا فاصلے پر کھڑی عنیزہ پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔ نیما اور عنیزہ کی شکلیں ایک لمحے کے لیے اس قدر مسخ لگیں کہ تمام ماحول پر حاوی ہو گئیں۔

"بس بھائی! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، مراقبہ کل بھی کیا جا سکتا ہے۔" بھابی کی شرارت سے کھنکتی آواز اسے واپس لے آئی۔ وہ آرسی مصحف کی رسم کے لیے آئینہ لیے کھڑی تھیں۔

ابھی تک یہ ہی طے نہیں ہو پایا تھا کہ رسم ابھی ہو گی، کہ کھانے کے بعد۔ بشریٰ کو جلدی پڑی تھی۔ سو سنہری فریم والا بڑا سا آئینہ ان کے درمیان رکھ دیا گیا۔

مناہل کی آنکھیں تو اب بھی بند تھیں جبکہ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی دل میں اترنے والی دھنک کو شعوری کوشش کے باوجود نہ روک سکا۔

وہ تمام شکلیں جو اس کی روح پر بوجھ بن گئی تھیں، ایک لمحے میں چھٹ گئیں۔ اب مطلع بالکل شفاف تھا اور اس پر ابھرنے والی مناہل کی تصویر بہت واضح ہو گئی تھی۔

"اوہو! یہ تو غرق ہی ہو گئے۔" منزہ نے جھٹ آئینہ کھینچ لیا۔ مناہل بری طرح سرخ ہو گئی۔ جبکہ وہ بھی کچھ جھینپ سا گیا۔ لحظہ بھر گلابی پڑتے چہرے کو دیکھا اور نظر پھیر لی۔

وہ تینوں ـــــ نیگ کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ رسموں کے معاملے میں چونکہ اس کی معلومات صفر تھیں۔ لہٰذا انہوں نے اسے خوب خوب لوٹا۔ ہارون چیختا ہی رہا۔ مگر انہوں نے تین ہزار آرام سے نکلوا لیے۔

"پاگل! یہ کوئی رسم تھوڑا ہی تھی۔" زمان بھائی بھی وہیں چلے آئے تھے۔

"چھوڑیے زمان بھائی، پیسے کا کیا ہے اصل چیز تو دل کی خوشی ہے اگر یہ یوں ہی خوش ہیں تو یوں ہی سہی۔" اس کا جملہ مناہل کے دل کو بری طرح دھڑکا گیا۔

شریکِ سفر کے خیالات کی بلندی اسے مسرور کر گئی۔ ان تینوں نے فوراً ہی زمان کو انگوٹھا دکھا دیا۔ وہ بری طرح چڑا، تو سب ہنس پڑیں۔ مناہل کے تراشیدہ لب بھی بے ساختہ کھل اٹھے تو سامنے سینٹر ٹیبل پر پڑے آئینے میں اس کا چہرا دیکھ کر وہ مبہوت سا رہ گیا۔

رخصتی کا وقت آیا تو مناہل جانے کیوں رو پڑی۔ وہ خاموشی سے اسے آنسو بہاتا اور سب کو دلاسا دیتے ہوئے

دیکھنے لگا - آخر میں زہرہ بیگم جانے کہاں سے چلی آئی تھیں۔ اس کا منہ حلق تک کڑوا ہوگیا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے، تمہارا مستقبل محفوظ رکھے بچی۔" مناہل کو سینے سے لگاتے ہوئے انہوں نے بھس میں آخری چنگاری ڈال دی۔ اور وہ جو اس ذرا سے عرصے میں قدرے شانت ہوا تھا، پھر بھڑک اُٹھا۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ محفل کا خیال اور ماموں جان کا لحاظ تھا۔ ورنہ وہ انہیں خوب سُناتا۔ رستے بھر گاڑی میں بھی وہ بھابی اور بشریٰ باجی کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں ذرا سا مسکرا بھی نہ سکا۔

"ذرا تبسم ہی بکھرا دیجیے دیور جی۔ مانا کہ فتح کر کے لے جا رہے ہیں، مگر ایسا بھی کیا غرور۔" بھابی نے دروازے تک اُسے چھیڑا، تو وہ جبراً مسکرا کر اندر چلا آیا۔

کتنی گھٹن تھی اس کے اندر جبکہ کمرہ اے۔سی کی خنکی سے جنت بنا رہا تھا۔ کوٹ ایک طرف پھینک کر اس نے الماری کھول کر جانے کیا نکالا۔ مناہل دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس کے غصے سے تو وہ پہلے بھی ڈرتی تھی، اب بھی اس کے تیور خاصے جارحانہ لگ رہے تھے۔

"یہ لیجیے۔ آپ کی رونمائی۔" اس کا خالی ہاتھ پکڑ کر اس پر ایک مخملی ڈبیہ دھر دی۔ وہ بُری طرح شپٹا گئی۔ "انگوٹھی ہے پسند آئے تو پہن لیجیے۔"

"جی۔!" وہ بلاارادہ ــــ اُسے دیکھے گئی۔

"اور یہ آپ کی امانت۔" اس کی نظروں کا فسوں نظر انداز کرتے ہوئے جانے کتنی نوٹوں کی گڈیاں اس کے سامنے ڈال دیں۔ آواز گو کہ نرم تھی مگر لہجہ عجیب سا تنا ہوا رکھا تھا۔

"یہ کیا؟" حیرت و استعجاب نے لفظوں کا روپ دھار لیا۔ کشادہ آنکھیں مزید کشادہ ہوگئیں۔

"آپ کا حق مہر۔" اس کا لہجہ قطعی سپاٹ تھا۔

"کیا۔؟" بے ساختہ چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

"ٹیک اٹ ایزی۔" اس نے بلاارادہ مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی، مگر وہ تو یوں دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر روئی کہ وہ خود شپٹا گیا۔

برسوں کا اُبال - اس کے اندر تھا۔ یہ لاوا کسی پر تو اگلنا تھا اور جب سامنے کوئی اپنا ہو تو یوں تو ہوتا ہی ہے۔

"مناہل پلیز۔" وہ زِچ سا ہوگیا۔ اس کی سسکیاں سے متاسف کر گئیں۔

"آپ۔" وہ ہاتھ ہٹا کر اسے کچھ کہنے لگی تھی، مگر اس کے چہرے پر اتنی تھکن رقم تھی کہ الفاظ کہیں اندر ہی گم ہوگئے۔ صرف تاسف اور رنج بھری نظریں اس کے چہرے پر ڈالیں تو وہ بُری طرح پشیمان ہوگیا۔

"آئی ایم سوری۔ میرا انداز آپ کو شاید ناگوار لگا۔" وہ ندامت سے کہہ رہا تھا۔ "مگر اب تو ایسے ہی گزارا کرنا ہوگا۔" خفت کے باوجود جانے کیسے مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ مناہل نے پریشانی سے اس کے پل پل بدلتے موڈ کو دیکھا۔ متورم چہرا بے حد حسین لگ رہا تھا۔

"مگر آپ نے یہ سب۔" سوال اس کے لب پہ آ ہی گیا۔

"ضروری ہے آپ کے لیے۔ سیکیورٹی سمجھ لیں اسے۔" وہ خود ہی کہہ کر استہزائیہ سا ہنس پڑا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ ہونٹ بھینچ کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روک رہا تھا۔ مناہل نے اُلجھی ہوئی نگاہیں اس کی گہرے گہرے آنکھوں میں ڈالیں، تو وہ جیسے کسی خواب سے جاگا۔

اس کے سامنے اپنی تمام تر خوبصورتیوں اور قاتل اداؤں سمیت ایک ایسا وجود بیٹھا تھا جو لمحے بھر کے لیے اسے سب کچھ بھلا گیا۔

"انگوٹھی میں پہناؤں کہ آپ خود زحمت کریں گی؟" شوخی سے مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر آئی لٹ کھینچ کر وہ بولا تو وہ اپنے حلیے اور موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے سُرخ ہوگئی۔

ولیمے میں شرکت کے لیے ہارون کے گھر والے پہنچے تو وہ بے حد خوش ہوگیا۔ مناہل کو لینے کے لیے کسی کو آنا تو تھا نہیں۔ لہٰذا پورا دن گھر میں خاصا ہلہ گلہ رہا۔ منزہ نے اس روز والے واقعے کو قطعی طور پر نظرانداز کر کے اپنا رویہ نارمل رکھا تو وہ بھی اپنے ظرف سے مجبور ہو کر اسے معاف کر گیا۔

"میں اندر آسکتی ہوں صہیب۔" بشریٰ باجی نے اندر جھانکا۔

"ارے باجی! آپ کب سے اجازت طلب کرنے لگیں۔" وہ جو ہاتھوں کا تکیہ بنائے صوفے پر نیم دراز تھے فوراً

اُٹھ بیٹھا۔ بشریٰ مسکرائی اندر چلی آئیں۔ مناہل تیار ہونے پارلر گئی ہوئی تھی۔

"تم تیار نہیں ہو رہے۔ ہارون اور زمان کو میں نے تاکید بھی کی تھی کہ وہ تمہیں دیکھ لیں جا کر۔ معلوم ہے مجھے تم اب تک سُست الوجود ہو۔" وہ آتے ہی شروع ہو گئیں، اور وارڈروب سے کپڑے نکالنے لگیں۔

"صرف چینج ہی تو کرنا ہے نا، بعد میں کر لوں گا ابھی تو بہت وقت ہے۔" وہ کسلمندی سے بولا۔

"اب خود کو سدھار و لڑکے! ذمہ داری بڑھ گئی ہے تمہاری۔ اتنی پیاری سی لڑکی کو پریشان مت کرنا۔ اسے خوش رکھنا سمجھے۔" وہ پلٹ کر اسے سمجھانے لگیں۔

"کوشش کروں گا۔" وہ ہنسا۔

"بکو مت۔" بشریٰ نے اس کا کان کھینچ لیا۔ "ویسے ایک بات بتاؤ مناہل تمہیں کیسی لگی۔" اچانک ہی انہوں نے رازداری اور اشتیاق سے سوال جڑ دیا۔ وہ انہیں ٹالنے کا سوچ رہا تھا کہ انہوں نے دوبارہ کان پکڑ لیا۔ "ڈھنگ سے جواب دو صہیب ورنہ خیر نہیں۔"

"اچھی ہیں بھئی ٹھیک ہیں۔ بس خوش۔" جیسے جان چھڑائی۔

"صرف اچھی نہیں بلکہ بے حد اچھی۔" بشریٰ نے صاف گوئی سے کہا۔

"کتنے پیسے دیے ہیں۔" وہ کچھ شوخ ہوا۔

"اوہو تو موصوف آج بہت شوخ ہو رہے ہیں۔" بشریٰ نے اسے خفیف کر ڈالا۔ "یہ ہونا بھی چاہیے لڑکی ہی اتنی اچھی ہے۔"

"ہوں۔ ویسے حیرت ہے کہ وہ مجھ سے شادی پر راضی کیسے ہو گئیں۔" اس کا کامپلیکس پھر عود کر آیا۔ قدرے سنجیدگی سے بشریٰ کو دیکھا۔

"کیوں تم کیا خدانخواستہ بیمار یا معذور ہو جو وہ اعتراض کرتی۔" وہ بھڑک گئیں۔

"اعتراض کرنے کے لیے محض بیمار یا معذور ہونا ضروری تو نہیں۔" وہ پھر خود اذیتی کا شکار ہونے لگا۔ "آپ نے انہیں میرے متعلق بتا دیا تھا نا۔" وہ پوچھ رہا تھا

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔" بشریٰ اتنے ہی سکون سے بولیں جتنے شدت سے اس کے اندر طوفان آیا تھا۔

"کیا۔؟" ساری خوشی اور شوخی ہوا ہو گئی۔ "یہ انہوں نے کیا کیا۔"

"پاگل نہ بنو صہیب۔ امی نے اس سے تمہارے لیے رائے مانگی اور اس نے سر جھکا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا بلاوجہ گڑے مردے اکھاڑنے کی نہ اس نے ضرورت محسوس کی، نہ ہم نے ضروری سمجھا۔" بشریٰ کا اعتراف اسے پاگل کر گیا۔

"یہ آپ نے بہت بُرا کیا بشریٰ باجی۔" اس نے دونوں ہاتھوں پہ سر گرا لیا۔

"بے وقوف نہ بنو صہیب! اگر مناہل کے نزدیک یہ سب جاننا ہی اہم ہوتا تو وہ ہم سے سوال ضرور کرتی۔ خوامخواہ کے واہموں کو دل سے نکال دو۔ نئی زندگی شروع کی ہے تو خوشی اور اعتماد کے ساتھ اس کی ابتدا کرو۔"

ہارون اس کے پاس آیا تو وہ خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ مناہل کا رات والا استعجاب یاد کر کے اسے احساس ہو رہا تھا۔ کہ وہ واقعی اس کی زندگی کے اس اہم باب سے ناواقف ہے جو اس کی کتابِ زیست پر چھا چکا تھا۔ جانے آنے والے دنوں میں اس کا رویّہ کیا ہوتا۔ تھوڑا بہت سکون جو اسے نصیب ہوا تھا۔ بشریٰ کی باتوں سے غارت ہو گیا۔

پیرل کانٹینینٹل (PC) کے روف ٹاپ چاندنی ریسٹورنٹ میں ولیمے کا انتظام تھا۔ جو کہ ہارون اور بڑے بھیا نے ڈیکوریٹ کروا کر مزید حسین بنا دیا تھا۔

اس کے پہنچنے کے بعد مناہل بھابی اور منزہ کے ساتھ پارلر سے ڈائریکٹ وہیں آ گئی۔ تصویروں اور مووی کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ مگر آج اس کا دل جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ مناہل کو اُس کے ساتھ لا کر بٹھایا گیا تو وہ ذرا سا چونکا۔

بوتل گرین کورے کے کام والے مغلئی طرز کے لباس میں وہ آج کل سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ چہرے پر مسرتوں کے ہزاروں رنگ تھے۔ وہ ان رنگوں کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔

اگر اسے میری اصلیت کا پتا چل جائے تو کیا یہ سارے رنگ محض ایک سیاہ ماتمی رنگ میں تبدیل نہیں ہو جائیں گے۔" اندر باہر بس ایک ہی سوال چکرا رہا تھا۔

صہیب حسن۔ ایسے ہی پل صراط سے گزر رہا تھا جہاں محض اس کی بے یقینی اور محبتوں پر نا اعتباری اسے پریشان کر رہی تھی۔

"مناہل ایک لڑکی ہے جسے معاشرے میں جینے کے لیے ایک مرد کے سہارے کی ضرورت ہے اور میں محض ایک سہارا ہوں، سہاروں سے محبت نہیں ہوتی، ان سے انسیت بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ مجبوری ہوتی ہے اور مجبوریاں خوشی سے نہیں اپنائی جاتیں۔ سایا چاہے کانٹوں بھرے درخت کا ہو، یا پھولوں سے لدے پیڑ کا۔ صرف دھوپ سے بچنے کے لیے اہم ہوتا ہے۔"

اپنی سوچ ہر ایک کو درست لگتی ہے۔ سو وہ بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا ذہن صحیح سمت میں پرواز کر رہا ہے۔ سب نے اس کی خاموشی کو بہت محسوس کیا۔ ہارون نے تو ایک آدھ بار اسے ٹوک بھی دیا۔ مگر وہ کیا کرتا کہ اندر دل اتنا شور تھا کہ اسے کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ولیمے کے بعد دن بہت برق رفتاری سے گزرے، بشریٰ باجی نے دعوت کی ابتدا کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس دوران مناہل اسے سمجھنے کی کوشش میں مزید الجھ گئی۔ کبھی وہ یوں مہربان ہوتا جیسے صحرا پہ بادل بن کر برس جائے گا، اور کبھی یوں چلچلاتی دھوپ بنتا کہ وہ سائبان تلاش کرتے تھکنے لگتی۔ اس کے اندر کون سے گرداب اٹھ رہے تھے، وہ لاعلم تھی، شروع میں بانی رہا تو وہ کچھ دھیما بھی رہا، اس کے جانے کے بعد تو بالکل ہی اکھڑ کر رہ گیا، پندرہ دن گزر چکے تھے شادی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو کر ختم ہوا تو اس نے پشاور جانے کا قصد کر لیا۔ وہ بھی تنہا۔

"صہیب بیٹا! اب اپنے ساتھ مناہل کو بھی لے جاؤ۔" مامی جی سے اس نے اجازت لیتے ہوئے اپنے جانے کا بتایا تو وہ شفقت سے کہنے لگیں۔

"انہیں بھی لے جاؤں گا مامی مگر چونکہ یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا، اس لیے میں وہاں رہائش کا انتظام کیے بغیر ہی چلا آیا۔ اب تک تو ہارون کا ساتھ رہتا تھا۔ مگر شادی کے بعد یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگتا وہاں گھر لے کر اسے سیٹ کر لوں تو پھر آ کر انہیں بھی لے جاؤں گا۔" نظر جھکا کر اس نے عذر پیش کر دیا۔

"تم بھی یہیں آ جاؤ صہیب۔" بڑے بھیا بول اٹھے۔

"جی بھیا سوچوں گا۔" اس نے سعادت مندی سے کہہ کر بات ختم کر دی۔

مناہل نے اس کے جانے کا سنا تو پہلے تو حیران ہوئی پھر افسردگی کے بادل دل پہ چھا گئے۔ وہ صہیب کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اب بھی نہ جان سکی کہ وہ اس سے کیوں جان چھڑا رہا ہے۔

"یہ کاغذات لے لیجیے۔" اس رات وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا کہ وہ ایک بڑی سی فائل لے کر اس کے پاس چلی آئی۔

"یہ کیا ہے۔" سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"یہ پاپا نے میرے لیے کچھ پلاٹس لیے تھے اور ساتھ ہی بینک میں کافی سرمایہ بھی جمع کر رکھا ہے۔" وہ سنجیدگی سے نظریں جھکا کر بول رہی تھی۔ "یہ سب آپ رکھ لیں۔ میرا مطلب ہے کہ مجھ سے اس کی ذمہ داری نہیں اٹھائی جا سکتی۔" اس کی تند نگاہوں کے سامنے اس کا حوصلہ پست ہونے لگا۔

"یہ سب آپ کا ہے، آپ ہی سنبھالیے۔" بمشکل خود کو کنٹرول کر کے وہ بولا۔

"میرا اثاثہ آپ سے الگ تو نہیں صہیب۔ کیا جو میرا ہے، وہ آپ کا نہیں؟" وہ حیران نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھی۔ "پاپا نے یہ سب میرے اور میرے ہونے والے شوہر کے نام کیا تھا۔ یعنی آپ کے نام۔" اس کے روکھے انداز پر وہ سنبھل کر بولی۔

"یہ سب آپ رکھیں میڈم۔ آپ کی حفاظت کے لیے یہ سب بے حد ضروری ہے۔" وہ پھر انگارے چبانے لگا۔

"میری حفاظت کے لیے آپ موجود ہیں صہیب۔" اس کے لہجے کے یقین پہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"اور اگر خطرہ مجھ سے ہی ہو تو؟" سوال اس قدر غیر متوقع اور کڑا تھا کہ وہ ششدر رہ گئی۔

"جی؟" وہ اسے یونہی حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ "میرے خدا آخر میں انہیں کیا سمجھوں، جانے میری کس بات نے انہیں مجھ سے بدگمان کر دیا ہے۔" تکیہ اس کے بے آواز آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ اور باہر ٹیرس پر ٹہل ٹہل کر وہ خود کو مزید سزا دیتا رہا۔

مناہل کے پاس اس کے باپ کے نام کا غرور تھا جبکہ

وہ اس معاملے میں قطعی تہی داماں تھا۔ جو کچھ اس کے پاس تھا۔ وہ اس کی ماں کا حصہ تھا۔ کچھ ماموں جان کی عنایتیں تھیں۔ مگر ایسی کوئی چیز اسے آج تک حاصل نہ ہو سکی تھی، جو اپنے باپ کے حوالے سے اسے ملتی۔ مناہل کی باتیں اسے محرومی کے حصار میں مزید قید کر گئیں۔

صبح اس کی فلائیٹ تھی، سب نے حسبِ توقع اسے چھیڑا۔ اس کی خاموشی کو مناہل سے دوری کے خیال سے افسردہ ہونے پر تعبیر کیا اور وہ پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجائے جانے کا منتظر تھا مگر اخبار میں گم ہو گیا۔

رات پیکنگ ادھوری رہ گئی تھی جو مناہل نے مکمل کی۔ وہ جانے سے پہلے کمرے میں آیا تو بھیگی پلکوں سے سوٹ کیس بند کرتی مناہل پر نظر پڑتے ہی متاسف ہو گیا۔ وہ اسے بھی اپنے ساتھ ناکردہ گناہوں کی سزا دے رہا تھا۔ جبکہ وہ مہر بہ لب تھی، ایک بار بھی شکوہ نہ کیا۔

"میں کوشش کروں گا کہ جلد آپ کو وہاں بلا سکوں۔" اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لیتے ہوئے وہ بے اختیار ہی کہہ گیا۔ مناہل کے چہرے پر یکدم اتنے رنگ کھلے کہ وہ وحشت ندامت میں گھرنے لگا۔

"میں ہر لمحہ آپ کا انتظار کروں گی۔" میک اپ سے بے نیاز آنسوؤں سے دھلے دھلائے چہرے پر بھیگی مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اناب یلو کرتے شلوار میں اس کا طلاوی حسن مزید نکھر رہا تھا۔ وہ انگلی سے اس کے گالوں پر پھسل آنے والے آنسو صاف کر کے اللہ حافظ کہتا باہر نکلا تو وہ یونہی کھڑی آنسو بہانے لگی۔

؎ تھے جیسے بھی حالات الگ بات ہے لیکن
ممکن ہی نہیں تھا کہ تیرا دھیان نہ کرتے

پشاور پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اب میں اور پہلے میں بہت فرق پڑ چکا ہے۔ ان سولہ سترہ دنوں میں زندگی اور احساسات بہت بدل گئے تھے، تمام بدگمانیوں کے باوجود مناہل کا خیال اس کے ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔ اس کی آواز اس کا انداز اس کے آنسو، ہنسی مسکراہٹ اور آنکھوں کے رنگ سب اسے یوں ازبر ہو کر یاد آ رہے تھے، جیسے صدیوں سے وہ ساتھ ہی رہے ہوں۔

"اتنا تو تم نے نیما وقار کو کبھی مس نہیں کیا صہیب حسن۔" دل کی بات پر وہ خود ہنس پڑا۔ نیما وقار جسے اس نے اپنے دل کی تمام تر شدتوں سے چاہا تھا۔ جبکہ مناہل اس کی زندگی میں لائی گئی تھی۔ واقعی رشتوں کے ساتھ محبتیں بھی بندھ جاتی ہیں۔

ہارون اسے اکیلا دیکھ کر اچھا خاصا خفا ہوا، اس نے گھر میں مناہل کے استقبال کے لیے کافی اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہ بمشکل اسے اپنا نقطۂ نظر سمجھا سکا۔ پہلے تو وہ اس بات پر راضی ہی نہ ہوا کہ وہ اور مناہل علیحدہ رہیں۔ مگر جب اس نے بھی دھمکی دے ڈالی تو ہاں کرتے ہی بنی۔

دن مخصوص رفتار سے گزرتے رہے۔ اس نے آتے ہی آفس کا رخ کیا، اس کی غیر موجودگی میں ہارون پر بہت بوجھ پڑ گیا تھا۔ وہ واپس آیا تو پھر سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

کراچی سے آنے والے خطوط میں اب مناہل کے خط بھی شامل ہو گئے تھے، جن میں سے کبھی اسے محبت کی خوشبو آتی اور کبھی مجبوریوں کی ناگوار مہک۔ یہاں آتے ہی اس نے گھر کی تلاش شروع کر دی تھی، اور جب من پسند گھر ملا تو اس نے اپنے وسائل کم ہونے کے باوجود اسے خریدنے کا ارادہ کر لیا۔

"اتنی بڑی رقم کا کیا کرو گے صہیب! جانتے ہو، اس طرح سرمایہ کم پڑا تو بزنس ڈاؤن ہونے لگے گا۔" ہارون اس کے جنون پر متفکر ہو گیا تھا۔

"تم میرے شیئر خرید لو ہارون، مگر یہ سب تو مجھے کرنا ہی ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے اپنے ارادے کو شکست نہ دینے کا اعلان کیا تو ہارون بھی بپھر گیا۔

"پاگل ہو گئے ہو تم۔"

"تو پھر مجھے بتاؤ۔ میں خود سے کیا عہد کیسے توڑ دوں۔" وہ اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھا تو ہارون نے ہتھیار ڈال دیے۔

"ارے۔ تم مجھ سے قرض لے لو۔ تمہارے حصے کے پرافٹ میں سے میں آدھا رکھ لوں گا۔ اوکے۔ مگر آئندہ اس قسم کی فضول باتیں مت کرنا اور یہ قرض بھی میں صرف اسی لیے دے رہا ہوں کہ تم دوستی میں بھی انا اور خودداری کو لے آتے ہو۔" وہ روٹھا روٹھا سا کہہ کر اٹھ گیا۔

"تمہیں بھی منالیں گے ہارون علی جاہ۔" اس نے صوفے

کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

خوبصورت علاقے میں بنا وہ گھر ہارون کو بھی پسند آیا۔ آج کل صہیب اسے ڈیکوریٹ کرنے میں لگا ہوا تھا جب کام مکمل ہو گیا تو سب سے پہلے ہارون کو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا۔

"بہت خوبصورت ہے صہیب۔ تمہاری چوائس ہمیشہ اچھی رہی ہے۔" ڈیکور اور کلر اسکیم ——— بہت خوبصورت تھی "مگر ایک بات بتاؤ تم نے یہ گھر بھابی کے نام کیوں کیا ہے۔"

"میں مناہل کو تحفظ دینا چاہتا ہوں۔" اس نے مخصوص خود اذیتی لہجہ اپنایا۔

"تحفظ۔۔؟" ہارون ششدر رہ گیا۔ "تحفظ تو شوہر سے ہوتا ہے صہیب یہ اینٹ پتھر کی دیواریں تو بہت کمزور ہوتی ہیں۔ محبت سے بڑھ کر محفوظ قلعہ بھلا کیا ہو سکتا ہے!"

"تم نہیں سمجھو گے ہانی۔ میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے کسی موڑ پر جب اسے پتا چلے کہ میں رومی حسن کا بیٹا ہوں اور وہ خود کو ان سکیور محسوس کرے تو اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ کم از کم فنانشل تو وہ مضبوط ہو۔" لان کی گھاس پیروں تلے روندتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"خدا کی قسم صہیب! تم بالکل پاگل ہو۔ تمہیں آج تک محبتیں پرکھنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ جبھی یہ فضول باتیں کی ہیں تم نے بھابی کے لیے۔ احمق انسان جو کچھ تم انہیں دے رہے ہو یہ تو بہت پہلے سے ان کے پاس ہے اگر کچھ دینا ہی ہے تو اعتبار دو اعتماد کرو ان پر، اپنے اور ان کے درمیان موجود رشتے اور اس رشتے سے پھوٹتی محبت کا یقین کرو۔" ہارون نے متاسف ہو کر غصیلے انداز میں کہا تو وہ بس یونہی نظر اٹھا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

بہت جلدی کی تب بھی ڈیڑھ مہینہ بہت تیزی سے گزر گیا۔ کراچی سے ہر دوسرے خط میں اس کی لاپروائی اور کوتاہی پر اسے خوب سنایا جا رہا تھا۔ بشریٰ باجی اور مامی فون پر اسے اچھا خاصا جھاڑ چکی تھیں لہٰذا کام مکمل ہوتے ہی اس نے کراچی کی سیٹ بک کرالی۔

بغیر اطلاع کے آ کر ان سب کو سرپرائز دینے کے خیال سے وہ خاصا پُرجوش ہو رہا تھا مگر گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ سب چھوٹے ماموں کی طرف عنیزہ کے نکاح میں گئے ہوئے تھے۔

"گویا کہ گھر میں کوئی نہیں۔" اس نے ملازمہ سے پوچھا۔

"مناہل بی بی ہیں جی اندر۔" وہ اسے بتا کر کچن کی طرف مڑ گئی۔

دروازے پر دستک دیے بغیر وہ اندر آیا تو سامنے ہی فلور کشن پر کاسنی کاٹن کے سوٹ میں اردگرد سے بے نیاز گھٹنوں پر سر ٹکائے وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے بیگ زور سے زمین پر رکھا تو وہ اس بری طرح چونکی کہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ۔۔؟" ایک لمحے میں اتنے رنگ اس کے چہرے پر آ کر ٹھہرے کہ وہ شمار بھی نہ کر سکا۔

"سب لوگ شاید گھر پہ نہیں۔" وہ صوفے پہ آ کر ڈھیر ہو گیا۔

"جی عنیزہ کا نکاح ہے آج وہاں گئے ہیں۔" مناہل اس کے سرد رویے پر ٹھٹک سی گئی۔

"آپ نہیں گئیں۔" اس نے آنکھیں فلور کشن پر پڑے البم پر جما دیں جس میں ان کی شادی کی تصاویر تھیں۔ اس کے آنے سے پہلے مناہل انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"بس دل نہیں چاہا۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" مختصراً کہہ کر وہ جانے لگی۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں۔ بس چائے لا دیں۔" وہ اٹھ کر واش روم جاتے ہوئے بولا۔

فریش ہو کر باہر نکلا تو وہ چائے کپ میں انڈیل رہی تھی۔ چہرے پر آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کا تاثر تھا۔

"چائے۔" اس نے مگ اس کی طرف بڑھایا اور باہر جانے لگی۔

"پلیز ادھر آئیں۔" قدرے تذبذب سے اس نے اسے پکارا۔ وہ اپنی جگہ پر پلٹی اور حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ بادل شاید برسنے والا تھا۔ گھٹن اور حبس کا احساس بڑھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی تب ہی وہ آگے بڑھ کر مقابل آ گیا۔

"پرسوں کی فلائٹ سے ہم نے پشاور جانا ہے آپ پیکنگ کر لیں۔" دوستانہ انداز میں دونوں ہاتھ اس کے شانے پر دھرے تو وہ خوشی سے کھل گئی۔

اسے خوش دیکھ کر اس کا دل ہلکا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب بھی لوٹ آئے اور حسب توقع سرزنش کے بعد سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا۔ منزہ البتہ اپنے گھر پہ ہی تھی۔

مناہل کی مسرت دیدنی تھی۔ سب نے محسوس کیا اور سب کے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ دیکھ کر وہ جھینپ گیا۔

اگلے دن بشریٰ باجی اور منزہ بھی آگئیں اور ان کی معیت میں اس نے اپنا تمام سامان پیک کر لیا۔ سچی خوشی کی الوہی چمک اس کی آنکھوں میں جھلملاتی دیکھ کر وہ مناہل پر رشک کرنے لگا۔

اپنے گھر میں قدم رکھتے ہی اسے لگا جیسے وقت کی گردش ایک لمحے کے لیے تھم گئی ہو۔ خوشی و انبساط نقطۂ عروج کو چھو رہے تھے۔

"یہ گھر اب آپ کا ہے مناہل۔" وہ پورا گھر دیکھ کر واپس لاؤنج میں آئی تو وہ کہنے لگا۔

"یہ گھر ہمارا گھر ہے صہیب۔" اس نے "ہمارا" پر زور دیا۔

"یہ اس کے کاغذات ہیں۔" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے فائل کارنس سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ سب؟" وہ اپنے نام ملکیت کے کاغذات دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

"آج میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ کل آپ بھی سمجھ جائیں گی۔" وہ سنجیدگی سے کہتا بیڈروم کی طرف بڑھ گیا اور وہ دل میں آئے سوال بمشکل نظرانداز کرتی اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اندر لے گئی۔

مناہل کے یہاں آنے کے بعد شب و روز بہت بدل گئے۔ صہیب صبح اٹھتا تو چوڑیوں کی کھنک اس کے اطراف گونج رہی ہوتی تھی جانے وہ کب اٹھتی تھی جب اس کی آنکھ کھلتی تو وہ ہمیشہ اس کے کپڑے پریس کرتی نظر آتی اور جب وہ شاور لے کر باہر نکلتا تو وہ ناشتہ میز پر سجائے اس کی منتظر ہوتی۔

دھیرے دھیرے ان کے درمیان اجنبیت کی دیوار گرتی جا رہی تھی جس میں زیادہ کوشش تو مناہل ہی کی تھی کہ وہ صہیب کے بدلتے موسموں ایسے مزاج کے ساتھ بڑی فراخ دلی سے سمجھوتہ کر رہی تھی۔

شروع میں وہ دونوں یا تو کسی نہ کسی کو ڈنر کے یہاں مدعو ہوتے یا پھر ہارون زبردستی انہیں کھینچ لے جاتا مگر گزرتے دنوں کے ساتھ اس کا آنا جانا کم ہوتا گیا صہیب کی اپنی مصروفیات تھیں بزنس سے ہٹ کر جتنا

وقت بچتا وہ مناہل ہی کو دینے کی کوشش کرتا البتہ اب بھی ایک نادیدہ سا تناؤ وہ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔

اگر بشریٰ اسے یہ نہ بتاتیں کہ مناہل اس کے ماضی سے ناواقف ہے تو شاید اس کے کامپلیکس کا خول چٹخ جاتا مگر اب نہ تو اس میں سب کچھ کہہ دینے کا حوصلہ تھا اور نہ ہی اس بات کو بھول جانے کی قوت تھی۔

کبھی کبھی وہ یونہی ڈپریس ہو جاتا تو مناہل گھبرا جاتی اور اس کی سراسیمگی خود صہیب سے بھی چھپی نہ رہتی تھی ان تمام باتوں کے باوجود دن اچھے گزر رہے تھے۔

محبت اپنے آپ کو منوانے کا ہنر جانتی ہے۔ جبھی اس کے دل سے کم از کم ایک پھانس تو نکل گئی مناہل کا خاموش اظہار بہت قوی تھا اسی لیے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر کبھی کبھی روحی حسن کا خیال اس کے سکون کا شیرازہ بکھیر دیتا۔

اس روز وہ شام جلد ہی گھر آ گیا تو مناہل نے آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا۔ خود اس کا موڈ بھی اچھا تھا سو وہ فوراً ہی راضی ہو گیا۔

"پہلے ہارون بھائی کے گھر چلیں گے اور اس کے بعد آپ مجھے باہر ڈنر کرائیے گا۔" وہ وارڈروب سے کپڑے نکالتے ہوئے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔ "ان میں سے کونسا ڈریس پہنوں۔" بولتے بولتے سر اٹھا کر سامنے صوفے پر بیٹھے صہیب پر نظر ڈالی جو بڑے انہماک سے اسے ہی دیکھ رہا تھا یکدم سرخ ہو گئی۔ فوراً نظر جھکا لی۔

"کوئی سا بھی پہن لو۔ تم پر سب رنگ اچھے لگتے ہیں۔" آج وہ جانے کس موڈ میں تھا بلاارادہ ہی کہہ گیا۔ وہ حد درجے چونک کر مڑی اور گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"رئیلی۔" بے یقینی سے سوال کیا۔

"لکھ کر دوں۔" بڑی جاندار مسکراہٹ اس کے لبوں پر مچل رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ فوراً ٹوک گئی۔ "جذبے لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے نہ ہی ہندسوں کی مدد سے ان

کی سچائی اور گہرائی ناپی جاسکتی ہے،" بڑا سنجیدہ اور متین انداز تھا اس کا۔
"اوہو۔ ہماری نصف بہتر فلسفہ بھی جانتی ہیں۔" شوخی سے کہا۔
"آپ کی نصف بہتر سب کچھ جانتی ہیں جناب۔" وہ بھی جواباً چہکی۔

"کیا مطلب؟" لمحے بھر میں اس کا چہرہ متغیر ہو گیا لہجے میں تناؤ اور تندی اتر آئی۔ "کیا جانتی ہو تم؟ اور کیا جتانا چاہتی ہو۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"صہیب! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آئی سویئر۔ میرا مطلب کچھ جتانے کا تو نہ تھا۔" وہ وارڈ روب کے دروازے سے لگ کر جلدی سے صفائی پیش کرنے لگی۔
وہ اب تک بے یقین اور جانچنے والی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر کچھ سوچ کر "جلدی تیار ہو جاؤ۔" کہتا باہر نکل گیا۔
"میں شاید آپ کو کبھی نہ سمجھ سکوں صہیب!" گہری سانس بھر کر وہ بیڈ پر پڑے کپڑوں کے پاس ٹک گئی۔ اس کا ذرا سا غصہ اس کی جان بنا دیتا تھا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کب بھڑک اٹھے گا کبھی شعلہ تو کبھی شبنم۔
سرخ کڑھائی والے مسٹرڈ سوٹ پر بڑا سا ریڈ دوپٹہ پہن کر وہ باہر نکلی تو کافی سہمی ہوئی تھی۔ البتہ صہیب کا موڈ قدرے بہتر ہو چکا تھا۔
"چلیں۔" اسے توصیفی نظروں سے دیکھ کر سوال کیا تو اس نے جھٹ گردن ہلا دی۔
راستے بھر وہ خود ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تو وہ بھی پرسکون ہو گئی۔ ہارون کے گھر کافی ٹائم لگ گیا۔ اس کی دونوں بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں سب انہیں کھانے پر روک رہے تھے مگر اس نے منع کر دیا۔
سو وہ لوگ ریسٹورنٹ چلے آئے۔ گو کہ یہاں خواتین بہت کم ہوٹلنگ کرتی نظر آتی تھیں البتہ فیملی کیبنز اکثر بھرے رہتے تھے۔
اپنی اپنی پسند کا کھانا کھا کر وہ دونوں باہر نکل آئے۔ ریسٹورنٹ کے لان کے ساتھ بنا ہوا بڑا سا حوض تھا جس میں کنول کے بڑے بڑے سفید سفید

جیسے پھول تیر رہے تھے۔
"تمہیں کنول کا پھول کیسا لگتا ہے مناہل،" یونہی چلتے چلتے اس نے سوال کر ڈالا۔
"مجھے پسند نہیں۔" اس نے فوراً ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا۔
"کیوں؟" صہیب کے لہجے میں تحیر تھا۔

"کیچڑ میں کھلتا ہے اس لیے۔" وہ بلا ارادہ ہی کہہ گئی تھی مگر بات کی سنگینی کا احساس اس وقت ہوا جب صہیب اس سے دو قدم پیچھے ہی رک گیا۔ وہ متفکر سی مڑی۔ "کیا ہوا صہیب۔ میں کچھ غلط کہہ گئی کیا؟" وہ اس کی گہری نظروں سے سٹپٹا گئی۔
"نہیں مناہل صاحبہ۔ آپ نے تو بہت ٹھیک بات کہی ہے۔ کیچڑ میں کھلنے والے پھول واقعی پسند کے لائق نہیں ہوتے۔ ان تک پہنچنے کے لیے کیچڑ میں جو اترنا پڑتا ہے۔"
عجیب سے لہجے میں وہ بولتا اسے حد درجے تشویش زدہ کر گیا۔ بات مکمل کر کے رکا نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔
"صہیب! میری بات تو سنیں۔" وہ بوکھلا کر اس کے پیچھے چلی آئی۔
دروازہ کھول کر جب تک وہ بیٹھی صہیب گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ چہرے پر اتنی سختی اور روکھا پن تھا کہ وہ باوجود خواہش کے ایک لفظ بھی نہ پوچھ سکی۔ خوفناک حد تک تیز ڈرائیو کرتا وہ گھر آیا اور سیدھا اپنے بیڈ روم میں جا کر بند ہو گیا۔ خوشی کے سارے لمحے پھیکے پڑ گئے تھے۔
"میرے خدا! انہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔" اندر جانے کی ہمت نہ پاتے ہوئے وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ کر رو دی۔ "میں کس سے کہوں اپنا درد صہیب مجھے کچھ بتاتے بھی تو نہیں تو پھر میں کیسے جان لوں کہ وہ کیوں اتنے شکستہ ہیں۔" آنسو تسبیح کے دانوں کی صورت رخساروں پر بہہ رہے تھے۔
نرم تکیے پر سر رکھنے کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج جانے کیوں اسے ایسا لگا جیسے مناہل نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا ہو۔ اس کا کامپلیکس کسی عفریت کی طرح اس کے

ذہن کو جکڑ گیا تھا۔

پوری رات دونوں ہی سوچ کی بھٹی میں جلتے رہے مگر سرا کسی کے ہاتھ نہیں آرہا تھا صبح وہ بہت جلدی آفس جانے کے لیے اٹھ گیا۔ مناہل وقت مقررہ پر جب اندر آئی تو وہ تیار ہوچکا تھا۔ اس کی عجلت اسے ہراساں کرگئی۔

"ناشتہ لاؤں؟" ہمت کرکے پوچھ لیا۔

"مجھے بھوک نہیں۔" وہ رکھائی سے کہتا بریف کیس اٹھاکر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

گھر سے نکلا تو وہ آفس کے لیے تھا مگر اس وقت ذہن اس قدر بھٹکا ہوا تھا کہ وہ یونہی پیٹرول پھونکتا رہا۔ ادھر ہارون نے آج اہم ڈیلنگ کے لیے اسے خاص طور پر کہہ رکھا تھا جب وہ نہیں آیا تو پریشان ہوکر فون کر ڈالا۔

"کیا صہیب نہیں پہنچے۔ مگر وہ تو صبح ہی نکل گئے تھے۔" وہ پہلے ہی رو رہی تھی اس خبر پر مزید فکرمند ہوگئی۔ ہارون بھی تشویش زدہ ہوگیا۔

"اوہ۔" وہ چپ سا ہوگیا "آپ فکر نہ کریں بھابی میں پتا کرتا ہوں اس کا۔" کچھ دیر سوچ کر وہ کہنے لگا۔ لہجے میں تسلی اور دلاسا تھا۔

"ہارون بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے صہیب مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔" ہمدرد و مونس ملتے ہی وہ رو پڑی۔

"پلیز بھابی آپ روئیے مت میں آرہا ہوں آپ کی طرف۔" ہارون اس کی سسکیاں سن کر گھبرا گیا تھا۔ فون بند کرکے بھی وہ یونہی روتی رہی یہاں تک کہ پندرہ بیس منٹ میں ہارون گھر پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے بھابی۔ کیا صہیب سے جھگڑا ہوگیا ہے۔" اسے رات والے لباس میں یونہی بیٹھا دیکھ کر وہ چونکا۔

"میں کیا کہوں ہارون بھائی! میری تو سمجھ میں نہیں آتا کل رات وہ بس اچانک ہی خفا ہوگئے کس بات پر ناراض ہوئے ہیں میں تو یہ بھی نہیں جانتی صبح کے نکلے ہوئے ہیں اب تو دوپہر بھی ڈھل رہی ہے۔ جبکہ ان کا کہیں پتا نہیں۔" دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھر رو رہی تھی۔

"پلیز بھابی! خود کو سنبھالیں صہیب کوئی بچہ نہیں کہ گم ہوجائے گا۔ وہ یقیناً اپ سیٹ ہوگا اس لیے کہیں لانگ ڈرائیو پر چلا گیا ہوگا میں جانتا ہوں اسے عادت ہے یہ اس کی برسوں پرانی۔" وہ اسے دلاسا دے رہا تھا۔

"ہارون بھائی آپ تو ان کے اتنے پرانے دوست ہیں کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آخر ان کی ذات کا کونسا سرا اتنا الجھ گیا ہے کہ ان کی پوری شخصیت بکھر گئی ہے۔"

آنسو صاف کرتے ہوئے وہ بڑے درد سے پوچھ رہی تھی اور اسی لمحے لاؤنج میں داخل ہوتا صہیب باہر ہی ٹھٹک گیا۔ اتفاقاً مناہل کا سوال اس کی سماعت سے ٹکرا گیا تھا۔

"نہیں بھابی! ایسی کوئی بات نہیں۔" ہارون نے اسے بہلانا چاہا۔

"پلیز ہارون بھائی! آپ کو صہیب کی دوستی کی قسم۔ مجھے بتادیں آخر کیوں وہ اتنے روڈ ہوجاتے ہیں مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے ان کی بعض باتیں مجھے میری ہی نظروں میں گرادیتی ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں کیا دکھ ہے انہیں۔" تڑپ کر اس نے دوبارہ ہارون سے التجا کی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

"شاید آپ جانتی نہیں کہ صہیب کے والد۔" وہ اس کی قسم سے ہار گیا تھا "صہیب کے والد کچھ ایسی اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔" بڑے گھما پھرا کر اس نے جھجکتے ہوئے اپنے یار کا مسئلہ بتایا۔

"میں جانتی ہوں ہارون بھائی!" مناہل کا ٹھہرا ہوا لہجہ ہارون اور باہر کھڑے صہیب دونوں کو ششدر کرگیا۔

"کیا۔ آپ جانتی تھیں؟" ہارون نے اپنی حیرت کو لفظوں کا جامہ پہنایا "اپنے والد کی وجہ سے ہی تو وہ اتنا کامپلیکس ہے۔ ان کے نام کا طعنہ سن کر وہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔"

"مگر میں نے تو کبھی ان سے کچھ نہیں کہا۔" وہ بھی اپنی جگہ حیران بیٹھی رہ گئی۔ جس بات کو وہ قطعی اہمیت نہیں دیتی تھی وہ صہیب کی جان کا روگ

بنی ہوئی تھی۔

"اور پھر ان کے والد کچھ بھی تھے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا صہیب کی اپنی کوئی شخصیت نہیں۔ کیا ان کی خوبیوں اور اچھائیوں کی کوئی ویلیو نہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے احساس محرومی کا شکار ہیں ہمیرے خدا میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" اس کا سر چکرا گیا۔

"آپ یہ کب سے جانتی تھیں۔" ہارون نے قدرے توقف سے سوال کیا۔

"احسان انکل نے تو شادی طے کرنے سے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا۔ مگر یقین کریں ہانی بھائی میں نے اس بات کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ صہیب نے جس طرح اس رات میرے بابا کے لیے اپنا آرام ختم کیا تھا اور بعد میں بھی جس طرح انہوں نے مجھے مورل سپورٹ دی اس نے مجھے خرید لیا تھا۔ میں وہ رات دن بھول نہیں سکتی ہارون بھائی۔ انسانیت کا کوئی مول نہیں ہوتا نہ یہ کسی کی میراث ہوتی ہے میں صہیب کی بہت عزت کرتی تھی اسی لیے جب احسان انکل نے مجھ سے پوچھا تو زندگی میں پہلی بار مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔"

وہ برستی آنکھوں کو صاف کرتی کہے جا رہی تھی اور لاؤنج کے دروازے سے کمر ٹکائے صہیب کے اندر جیسے قطرہ قطرہ آب حیات ٹپک رہا تھا۔

"بس ایک ہی مسئلہ ہے اس کے ساتھ بھابی اور اسے صرف محبت سے حل کیا جا سکتا ہے۔" ہارون بہت متاثر ہو کر بولا تھا۔

"مگر انہیں تو میری محبت پر بھی اعتبار نہیں ہارون بھائی! شاید وہ نیما وقار کو اب تک دل سے نکال نہیں سکے یا پھر عنیزہ انہیں اب بھی مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔" وہ شکستگی سے کہہ رہی تھی۔

"نہیں بھابی!" ہارون نئے انکشافات پر بری طرح بوکھلا گیا۔ یہی حال صہیب کا تھا۔ اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ "آپ سے یہ سب کس نے کہا۔"

"عنیزہ نے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"شٹ۔ یہ لوگ کبھی اسے سکون سے نہیں رہنے دیں گے۔" ہارون غصے سے کھولتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ پلیز عنیزہ کی بات کا اعتبار مت کیجیے گا یہ ٹھیک ہے کہ نیما وقار کبھی صہیب کی پسند تھی مگر اب اس کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ رہ گئی عنیزہ مائی فٹ۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اسے یاد کیا جائے۔" ہارون کا سچائی اور غصے سے بھرا لہجہ اس کے دل سے سارے شکوک دھو گیا۔

اسی لمحے بیڈ روم کا دروازہ زوردار دھماکے سے بند ہوا۔ وہ دونوں اپنی جگہ اچھل گئے۔

"لیجیے، وہ گھامڑ آ گیا۔ پلیز اس طرح کے سارے وہم دل سے نکال دیجیے۔ وہ صرف آپ کا ہے بس ایک بار اس کا اعتبار لوٹ آئے تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور اس کے لیے آپ کو اسے اپنی محبت کا یقین دلانا ہو گا۔" ہارون نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اسے سمجھایا۔

"ہارون بھائی۔" وہ سہمی ہوئی لگ رہی تھی۔

"ٹیک اٹ ایزی بھابی۔ آپ جائیں اسے دیکھیں میرا خیال ہے وہ پاگل اب تک ٹھیک ہو چکا ہو گا۔" ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا حوصلہ بڑھاتا وہ اس کے روکنے کے باوجود باہر نکل گیا کیونکہ یہ مسئلہ تو بہر حال مناہل کو ہی حل کرنا تھا۔

دروازہ ہزار بار سوچنے پر اس نے کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ شام اتر آنے کے باعث کمرے میں ملگجا اندھیرا ہو رہا تھا۔ سامنے ہی وہ دشمن جان جوتوں سمیت صوفے پر نیم دراز تھا۔

"صہیب۔" آگے بڑھ کر اسے پکارا مگر وہ سو رہا تھا شاید۔ آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا لہٰذا وہ چند ثانیے جواب کا انتظار کرتی رہی مگر جب کئی منٹ تک وہ یونہی لیٹا رہا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کے بوٹ اتارے اور موزے ان میں رکھ کر صوفے کے نیچے کھسکا دیے۔

ٹائی کی ناٹ اب تک یونہی لگی تھی اس نے جونہی اسے ڈھیلا کرنے کے لیے تھاما اس کا ہاتھ صہیب کے مضبوط ہاتھوں میں آ گئے۔

"یا خدا۔" بے اختیار ایک چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ گھبرا کر صہیب کی طرف دیکھا وہ وارفتگی اور

ندامت کے سارے رنگ لیے اپنی گرے گرین آنکھیں اس پر جمائے ہوئے تھا۔

"صہیب آپ۔" اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے ہاتھ چھڑانے چاہے مگر گرفت مضبوط تھی۔

"کہو۔ کہو میں سن رہا ہوں۔" محبت پاش لہجہ اُسے رُلا گیا اس کے ہاتھوں پر سر رکھ کر وہ بے اختیار سی ہو گئی۔

"پلیز مناہل مجھے مزید شرمندہ نہ کرو۔ میں نے پہلے ہی اپنی ذات کی الجھنوں کے باعث تمہیں بہت رُلایا ہے۔" اسے مسلسل آنسو بہاتا دیکھ کر وہ مزید پشیمانی میں گھر گیا۔

"پلیز صہیب! مجھے اپنی ہی نظروں میں مزید ذلیل نہ کریں۔" جھٹکے سے سر اٹھا کر اس نے روتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ کو چاہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کے آپ کے والد کون تھے اور وہ کیا کرتے تھے۔ مگر کیا آپ کو میری آنکھوں میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کتنی دھند تھی آپ کی نظروں کے آگے کہ سامنے کا سارا منظر دھندلا گیا تھا۔ میرا قصور کیا تھا۔ جس کی اتنی بڑی سزا دی۔ میں رات دن کانٹوں پر چلی ہوں۔ صرف آپ کی اس سوچ کے باعث۔ مجھے بھی اوروں کی طرح کٹہرے میں کھڑا کرنے سے پہلے میرے دل میں تو دیکھ لیا ہوتا۔ کیا میں اس لائق بھی نہیں تھی۔"

اس کے ہاتھ جھنجھوڑتے ہوئے وہ خود فراموشی کے عالم میں کہے جا رہی تھی۔ اور جب کہہ چکی تو پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مناہل۔" کتنی دیر بعد وہ خود کو کچھ کہنے کے قابل بنا سکا۔ آج اس کا واضح اعترافِ محبت رگ رگ میں جیسے زندگی دوڑا گیا تھا۔ کتنے عرصے بعد دل پر چھایا جمود لوٹا تھا۔ اپنی ہستی معتبر لگی تھی اسے زبردستی اس کا سر اٹھا کر آنسو صاف کیے۔

"دیکھیں تو تمہاری آنکھوں میں کیا کچھ نظر آتا ہے۔" شوخی اور والہانہ جذبے اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ وہ جو بے خودی میں جانے کیا کیا کچھ کہہ گئی تھی بُری طرح بلش کر گئی۔ نظریں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ "اوہوں اب یہ تمہاری زیادتی ہے میں تمہاری آنکھوں میں جلتے ہوئے چراغِ محبت دیکھنا چاہ رہا ہوں اور تم ہو کہ نظریں چرا رہی ہو۔ یقین کرو اب تو میرے اردگرد کی دھند بھی چھٹ گئی ہے۔"

اس کے کان میں محبت بھری سرگوشی کر کے وہ بے اختیار ہنسا تو وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔

مناہل کا چہرہ شرم سے گلنار ہو رہا تھا صہیب نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ آج وہ کتنی اپنی اپنی سی لگ رہی تھی اُسے۔ حقیقت میں اپنی ذات کا نصف۔

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" بھاگنے کے لیے یہی بہانہ سوجھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ جست بھر کر اس کے راستے میں آ گیا۔ "پہلے وہ سارے مکالمے تو دہراؤ جو تم نے مابدولت کی محبت میں ابھی ابھی بولے تھے۔" وہ یکدم پہلے والا صہیب حسن بن گیا تھا۔

"صہیب پلیز۔" وہ جھینپ کر ملتجیانہ لہجے میں بولی تو اُسے اس پر ترس آ گیا۔

"او کے جاؤ معاف مگر سنو۔" راستہ دیتے دیتے وہ رک گیا۔

"جی۔" سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"آنکھیں تو میں نے تمہاری غور سے دیکھی ہی نہیں۔" وہ اس کی طرف بڑھا تو وہ تیزی سے سائیڈ سے نکل کر دروازے تک پہنچ گئی۔

"منہ دھو رکھیں۔ ابھی آپ کی طرف میرا بڑا حساب نکلتا ہے پہلے وہ چکتا کریں۔"

پلٹ کر انگوٹھا دکھاتے ہوئے اس نے خلافِ توقع ایسے مان بھرے لہجے میں کہا کہ وہ سر کھجا کر ہنستا رہ گیا۔

"اف صہیب کی ہنسی کس قدر خوبصورت ہے۔" کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ محبت سے سوچ رہی تھی پھر اپنی ہی سوچ پر سرشار ہو کر چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔